فصل سیزدہم

(۱)

کراچی آئے ہوئے سلمان کو کئی مہینے ہوگئے تھے۔ چچا سسر کے سیاسی اثر و رسوخ سے اسے ب غیر ملکی فرم میں ملازمت مل گئی تھی۔ پانچ سو روپے ماہانہ تنخواہ تھی، کام بھی زیادہ نہ تھا۔ پانچ ہزار روپے جو سسرال سے شادی پر سلامی میں ملے تھے اس کے پاس موجود تھے۔ اس میں سے چار ہزار روپے پگڑی دے کر اس نے شہر کے ایک بارونق علاقے میں رہائش کے لیے فلیٹ لے لیا تھا۔

اس میں تین کمرے تھے۔ فلیٹ روشن اور ہوادار تھا۔ پاس پڑوس بھی برا نہیں تھا۔ اس چار منزلہ عمارت میں زیادہ تر پارسی اور عیسائی خاندان آباد تھے۔ ان کے رہن سہن میں نفاست اور تہذیب تھی۔ اکثر رات گئے تک خوب چہل پہل اور ہنگامہ رہتا۔

آمدنی معقول تھی۔ مزے سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ سلمان عام طور پر گھر ہی میں رہتا تھا اور بیشتر وقت مطالعے میں گزارتا۔ ان دنوں اس کا صرف یہی مشغلہ تھا۔ مہینے کی شروع تاریخوں میں بازار سے نئی کتابیں خرید کر لاتا۔

فلیٹ کا ایک کمرہ اس نے مطالعے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس میں مختصر سی لائبریری بن گئی تھی۔ کتابوں کی دو الماریاں، مطالعے کی میز اور صوفہ سیٹ لگا کر اس نے کمرے کو قرینے سے آراستہ کیا تھا۔ کچھ فرنیچر اس نے خریدا تھا، کچھ کرائے پر لے آیا تھا۔

کراچی میں اس کا کوئی شناسا نہیں تھا اور نہ ہی کسی کے ساتھ اس نے مراسم بڑھانے کی

ف سوخ: اختیار، تعلقات۔ پارسی: آتش پرست۔

کوشش کی۔ دفتر میں کام کرنے والے ساتھیوں سے اسے کبھی انسیت پیدا نہ ہوئی۔ مگر وہ حتی الوسع کوشش کرتا کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔

اس نے آشفتہ مزاجی اور بے راہ روی ترک کر کے زندگی میں اب میانہ روی اور سلیقہ پیدا کر لیا تھا۔ چند موٹے موٹے اصول وضع کر رکھے تھے۔ ان میں ایک اصول یہ بھی تھا کہ دفتر کے کسی شخص سے بدمزگی پیدا نہیں کرے گا۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ اسے روزانہ وہاں سات گھنٹے گزارنا پڑتے تھے۔ البتہ دفتر سے باہر آنے کے بعد وہ اس ماحول کو اس فضا کو یکساں فراموش کر دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ کسی رفیق کار کے ساتھ اس کے تعلقات دفتر کی چار دیواری سے آگے نہ بڑھ سکے۔

اتوار کو عام طور پر وہ میٹنی شو دیکھتا یا سمندر کے کنارے کسی پر فضا مقام پر چلا جاتا اور گھنٹوں ریت پر بیٹھا شور مچاتی لہروں کو دیکھتا رہتا۔ اس کی زندگی میں ایک طرح کا ٹھیراؤ اور توازن آگیا تھا۔ اور وہ اس سے مطمئن بھی تھا۔ کبھی کبھی اسے کھانے کی دقت کا احساس ہوتا۔ ہوٹل کے کھانے سے وہ اکتا گیا تھا۔ اس نے ایک ملازم رکھ لیا اور گھر پر کھانا پکوانے کا بندوبست کیا۔ مگر وہ ہفتہ بھر بھی نہ ٹکا۔ ایک روز دفتر سے لوٹا تو ملازم غائب تھا۔ سوٹ کیس کا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ خیریت ہوئی کہ مہینے کی آخری تاریخیں تھیں اور سوٹ کیس میں صرف ۴۲ روپے پڑے تھے۔ ان ۴۲ روپوں کے علاوہ وہ کچھ کپڑے چرا کر بھی لے گیا۔ نقصان زیادہ نہ ہوا۔ لیکن اسی روز اس نے طے کر لیا کہ آئندہ ملازم نہیں رکھے گا۔ دوسرے روز اس نے بیوی کو بلانے کے لیے خط لکھا اور پھر ہر خط میں اصرار کرنے لگا۔

❁ ❁ ❁

جاڑوں کی ایک کہر آلود صبح کو سلمان کی بیوی رخشندہ کراچی پہنچ گئی۔ اس کے ہمراہ ایک ادھیڑ خادمہ بھی تھی۔ بیوی کو لینے صبح تڑکے وہ کینٹ اسٹیشن پہنچ گیا۔ ٹرین کچھ لیٹ تھی۔ اس انتظار میں اس نے ایک خاص کیف محسوس کیا۔ یہ ایسی مسرت تھی جو وہ بہت عرصے بعد محسوس کر رہا تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچی تو اس کا دل دھڑکنے لگا۔ انٹر کلاس کے ایک زنانہ ڈبے سے اس کی بیوی خادمہ کے ساتھ اتری۔

وہ برقع پہنے ہوئے تھی اور بہت شرمائی ہوئی نظر آرہی تھی۔ گھر آکر بھی اس کا یہی انداز رہا۔ بات کرتا تو نگاہ نیچے جھکی رہتی۔ چہرے پر کچھ عجیب سی گھبراہٹ نظر آتی۔

انسیت: محبت۔ حتی الوسع: جہاں تک ہو سکے۔ آشفتہ مزاجی: پریشان حالی۔ جاڑے: سردی کا موسم۔ کیف: سرور، مزہ۔

اس روز اس نے دفتر سے چھٹی نہیں لی تھی۔ لہٰذا وہ فلیٹ میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ دفتر روانہ ہو گیا۔ سہ پہر ہونے تک اس کا دل کام سے اچاٹ ہو گیا۔ اس روز وہ جلد ہی گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ دفتر سے نکلا تو بہت خوش تھا۔

وہ گھر جانے کے بجائے سیدھا بازار گیا۔ اس نے حلوہ سوہن خریدا، تازہ پھل لیے اور گل فروش کی دکان سے پھولوں کا ایک گلدستہ بھی خرید لیا۔ گھر پہنچا تو رخشندہ چائے پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے شاید کچھ ہی دیر پہلے غسل کیا تھا۔ اس کا چمپئی چہرہ پھولوں کی طرح شگفتہ تھا۔ ہلکے آسمانی لباس میں وہ دل کش اور دل آرا نظر آ رہی تھی۔ سلمان کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کی بیوی حسین اور خوب رو ہے۔

چائے پیتے ہوئے وہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے اسے چھیڑتا رہا تاکہ اس کا حجاب کسی قدر کم ہو جائے۔ اس وقت وہ ایک کھلنڈرے نوجوان کی طرح غیر سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ بات بات پر قہقہے لگاتا اور اوٹ پٹانگ باتیں کرتا۔ اس کی یہ شام بڑی خوشگوار گزری۔

سلمان کو جلد ہی اندازہ ہو گیا۔ کہ رخشندہ بڑی محنتی اور سگھڑ ہے۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ بیدار ہو جاتی۔ اس کے کپڑوں پر استری کرتی۔ شیو کرنے کا سامان آئینے کے سامنے رکھ دیتی۔ جتنی دیر وہ غسل کرتا اس عرصے میں وہ ناشتا تیار کر کے میز پر لگا دیتی۔ ہر چند کہ گھر میں خادمہ موجود تھی مگر اس کا سارا کام وہ خود کرتی اور اس میں اسے مسرت بھی محسوس ہوتی۔ سلمان نے اکثر غور کیا کہ اگر اس نے کسی کام کے لیے خادمہ سے کہا تو رخشندہ خود ہی وہ کام کر دیتی۔

شام کو واپس آتا تو چائے تیار ملتی۔ وہ تھکا ہوا سا کرسی پر بیٹھ جاتا۔ بیوی اس کے قدموں پر جھک کر جوتے کا فیتہ کھولنے لگتی۔ سلمان نے منع بھی کیا مگر وہ باز نہ آتی۔ اس کے کپڑے وہ خود ہی بدل کر پہناتی۔ اس کی ایک ایک چیز قرینے سے لگی ہوتی حالانکہ وہ رخشندہ کے آنے کے بعد خاصا لاپروا ہو گیا تھا۔ دفتر جاتا تو سارا کمرہ کباڑ خانہ بنا کر ڈال دیتا۔ مگر شام کو ہر چیز اپنی جگہ آراستہ ملتی۔

یہ بڑے پر کیف دن تھے۔ اس کی صحت بہت اچھی ہو گئی تھی۔ چہرے پر تازگی آ گئی تھی۔ وہ بھرا بھرا سجیلا جوان نظر آتا۔ لیکن ان دنوں وہ جس قدر باتونی ہو گیا تھا رخشندہ اسی قدر خاموش

لاپروا ہونا: دل نہ لگنا۔ چمپئی: چمکتا ہوا زرد رنگ۔ شگفتہ: کھلا ہوا، خوش۔ دل آرا: مراد خوبصورت۔ حجاب: شرم۔ سگھڑ: ہنر مند، قمیز کیف: خوشی سے بھرپور۔

رہتی۔ بہت کم بات چیت کرتی۔ کوئی بات اچھی لگتی تو صرف مسکرا دیتی۔ اس کے سفید دانت جھلکتے اور سرخ لب کپکپا کے رہ جاتے۔

سلمان کو اس کی مسکراہٹ بہت پسند تھی۔

❁ ❁ ❁

کراچی آنے کے بعد سلمان کی بیوی ابتدائی دنوں میں شدید تنہائی محسوس کرتی تھی۔ اجنبی شہر، اجنبی ماحول، اجنبی پاس پڑوس۔ نہ کسی سے میل ملاپ، نہ کہیں آنا جانا۔ سلمان دفتر چلا جاتا تو اس کے لیے وقت کاٹنا دوبھر ہو جاتا۔ لیکن سلمان نے زور دیا تو اس نے پڑوسیوں سے راہ و رسم پیدا کرنے کی کوشش کی اور رفتہ رفتہ خاصا میل جول پیدا کر لیا۔

بلڈنگ کے عیسائی اور پارسی خاندانوں کی بیشتر نوجوان عورتیں اور لڑکیاں بینکوں اور تجارتی اداروں میں سیکرٹری، ٹائپسٹ یا اسٹینوگرافر تھیں۔ وہ تنگ اسکرٹ پہنتیں، مردوں کی طرح سر پر چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے بال رکھتیں اور اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ قیمتی لباس اور میک اپ پر خرچ کرتیں۔ وہ اکثر سلمان کے فلیٹ میں بھی آتیں۔ ان کی مسکراہٹ مصنوعی تھی، ان کی نظروں کا انداز مصنوعی تھا، جسم کی حرکت مصنوعی تھی، وہ بنی سنوری کٹھ پتلیوں کی طرح نظر آتیں۔ ان کی باتیں عام طور پر لباسوں کے جدید ترین ڈیزائنوں، نئی فلموں، ڈانس پارٹیوں، پکنک اور شہر کے بڑے بڑے ہوٹلوں کے متعلق ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ شہزادی مارگریٹ کے کسی نئے اسکینڈل یا شاہ فاروق اور پرنس علی خان کے تازہ ترین معاشقے کے بارے میں بھی بات کر لیتیں اور ان کے تذکرے میں خاص لذت محسوس کرتیں۔

سلمان نے غور کیا کہ ان لڑکیوں کے ساتھ بڑھتے ہوئے میل جول نے اس کی بیوی میں بھی بعض تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ وہ باتوں کے دوران خواہ مخواہ انگریزی کے بھونڈے الفاظ استعمال کرتی۔

اس نے اپنے بالوں کا سیدھا سادا انداز بدل دیا تھا۔ میک اپ کرنے لگی تھی۔ اب اس کی یہ بھی خواہش ہوتی کہ سلمان اس کے حسن کی تعریف کرے۔ پہلے وہ فلم دیکھنے سے پرہیز کرتی تھی مگر اب دبے دبے الفاظ میں فلم دیکھنے کا اشتیاق بھی ظاہر کرتی۔

دوبھر: مشکل۔ بھونڈے: بے تکے۔ اشتیاق: شوق، خواہش۔

ایک اتوار کو پکنک کا پروگرام بنا جسے پڑوسیوں نے بنایا تھا۔ آمدورفت کے لیے انہوں نے ایک سٹیشن ویگن کا بندوبست کیا۔ سب اس میں لدلدا کر ہاکس بے پہنچے۔ اس روز رخشندہ کا برقع بھی اتر گیا۔ پارٹی میں خاصی تفریح رہی۔ سمندر میں غسل کیا گیا۔ ریت پر لیٹ کر سورج کی شعاعوں سے جسم سینکا گیا۔ بہت سی الم غلم چیزیں کھائیں۔ زور زور سے قہقہے لگائے۔ اور جب سورج بحیرہ عرب میں غروب ہونے لگا اور لہروں کا رنگ ارغوانی ہو گیا تو وہ تھکے ہارے واپس ہوئے۔

اس کے بعد اکثر اتوار کو پکنک پارٹیاں ہوتی رہیں۔

سلمان ہفتے کی شام کو بیوی کے ساتھ پکچر ضرور دیکھتا۔ ہر دوسرے تیسرے دن اس کے ہمراہ شام کو ٹہلنے نکل جاتا۔ دونوں کچھ شاپنگ کرتے اور کسی چائے خانے میں بیٹھ کر چائے پیتے۔ مہینے کی شروع تاریخیں ہوتیں تو وہ شہر کے کسی اچھے ہوٹل میں رات کا کھانا بھی کھا لیتے۔

زندگی ہنسی خوشی گزر رہی تھی۔ البتہ اس میں سکون کم اور ہنگامے زیادہ ہو گئے تھے۔ مگر یہ ہنگامے اس طرح دبے قدموں زندگی میں داخل ہوئے کہ سلمان کو مطلق احساس نہ ہوا۔ وہ ان سے رفتہ رفتہ مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن جس قدر یہ ہنگامے بڑھتے جا رہے تھے مطالعے کا شوق کم ہوتا جا رہا تھا۔ شروع شروع میں وہ معمول کے مطابق روزانہ چالیس پچاس اور کبھی کبھی تو سو سوا سو صفحات پڑھ ڈالتا تھا۔ ان دنوں وہ رات کو دیر تک پڑھتا رہتا۔ اس کے چہرے پر ٹیبل لیمپ کے شیڈ کا ہلکا عکس لہراتا۔ بیوی بار بار کروٹ بدلتی۔ خواہ مخواہ بات کر کے اسے چھیڑتی۔ وہ مطالعے میں محو رہتا۔ اب یہ محویت کم ہونے لگی تھی۔

بیوی میں شاپنگ کی عادت بڑھتی جا رہی تھی۔ جوتوں اور سینڈلوں کی اس نے درجنوں جوڑیاں خرید ڈالی تھیں۔ ہر فلم دیکھنے کے بعد وہ نیا لباس تیار کرانے کا پروگرام بناتی۔ میک اپ کا خرچ بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ نت نئے لوشن خرید کر لاتی۔ کوئی غسل کرنے کے لیے ہوتا، کوئی صرف ہتھیلیوں کی جلد نرم کرنے کے لیے اور کسی سے چہرے کا رنگ نکھارا جاتا۔ دونوں بازار جاتے اور کوئی شاپنگ نہ بھی ہوتی تب بھی فیشن میگزین ضرور خریدے جاتے، جن کو پڑھ کر وہ روزانہ نئے نئے انداز سے بال سنوارتی۔ درزی سے ایسے لباس سلواتی جن سے سینے کی جلد زیادہ سے زیادہ عریاں نظر آتی۔ ان کا فٹنگ اس طرح ہوتی کہ جسم کا ایک ایک خم نظر آتا۔

لگ: ذرا بھی، بالکل۔ خم: سر اور ابھار۔

اب وہ کام کرنے سے بھی جی چرانے لگی تھی۔ ہر وقت خادمہ کو احکامات دیتی رہتی۔ کام کرنے سے ہاتھوں کی جلد کھردری پڑ جانے کا اندیشہ تھا اور زیادہ محنت کرنے سے رنگت سانولا جانے کا خطرہ تھا۔ البتہ اب وہ یہ فن ضرور جان گئی تھی کہ اپنی دلکشی کی زیادہ سے زیادہ کس طرح نمائش کی جائے۔ وہ خوبصورت اور طرح دار لڑکی تھی۔ سج سجا کر شام کو چائے کی میز پر بیٹھتی تو کمرے میں تازہ پھولوں کی شگفتگی اور مہک رچی ہوتی۔ سلمان دفتر سے تھکا ہارا آتا۔ اس کے دل آویز چہرے اور پھڑکتے ہوئے جسم کو دیکھتا تو ساری تھکن بھول جاتا۔ اس کی قربت میں مسرت اور کشش محسوس کرتا۔

آمدنی نپی تلی تھی اور اخراجات بڑھتے جا رہے تھے۔ کتابوں کی خریداری کم ہوتے ہوتے صفر رہ گئی۔ مطالعہ بھی بند ہو گیا۔ تنخواہ ملنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی۔ بلکہ اکثر بلوں کی ادائیگی بھی رہ جاتی جن کو آئندہ ماہ پر ٹالنا پڑتا۔

سلمان اب سگرٹ گن گن کر پینے لگا تھا اور اپنی ضروریات کا سامان خریدنے سے حتی الوسع پرہیز کرتا۔ اب وہ اکثر بغیر استری کیا ہوا سوٹ پہن کر آفس چلا جاتا۔ دفتر میں ہر شخص سے اس کا لین دین شروع ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی ادائیگی میں تاخیر ہوتی تو بدمزگی بھی پیدا ہوتی۔ پہلے وہ دفتر کے ساتھیوں سے مراسم بڑھانے سے کتراتا تھا مگر اب کم از کم قرض خواہوں سے اسے زیادہ گھل مل کر رہنا پڑتا۔

سلمان کے مزاج میں رفتہ رفتہ چڑچڑاپن آتا جا رہا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر رخشندہ سے الجھ پڑتا اور پھر کئی کئی روز تک اس کا سلسلہ چلتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ دفتر سے گھر آنے کے بجائے کسی چائے خانے میں بیٹھ جاتا۔ پکچر دیکھنے چلا جاتا اور رات گئے واپس آتا۔ اس میں عجیب سا لاابالی پن آ گیا تھا۔

❀ ❀ ❀

جاڑے جا چکے تھے اور گرمیوں کی آمد آمد تھی۔

ایک روز دفتر کے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر "شب ماہ تاب" منانے کا پروگرام بنا۔ وہ ایک ہوٹل کے کھلے لان میں رات بھر بیئر پیتا رہا اور پورے چاند کی چاندنی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پارٹی میں دفتر کی کچھ عیسائی اور پارسی لڑکیاں بھی تھیں جن کو نشے میں دھت ہو کر اس نے بہت ستایا۔ ایک لڑکی کا اسکرٹ پھاڑ ڈالا۔ وہ نیم برہنہ ہو گئی۔ کئی کے گال نوچ لیے اور وہ بلیوں کی طرح غرا کر

طرح دار: ناز و ادا والی۔ دل آویز: دل کو لبھانے والا۔ لاابالی پن: لاپروائی، غیر سنجیدگی۔

ے لگیں۔ ایک موٹے تگڑے نوجوان کے چہرے پر اس نے بیئر کا پورا گلاس انڈیل دیا اور اس
پاڈگی ہوتے ہوتے رہ گئی۔

یہ بڑی سہانی رات تھی۔ پورا چاند نکلا ہوا تھا ہر طرف اجلی اجلی چاندنی بکھری تھی۔ آرکسٹرا
ز بج رہی تھی۔ پینے کے لیے اچھی بیئر تھی اور آس پاس نوجوان اور طرح دار لڑکیاں تھیں
ہلکے ہلکے سرور سے لڑکھڑا رہی تھیں۔ گھنٹیوں کے طرح بجتے ہوئے تیز تیز قہقہے لگا رہی تھیں اور
بے تکلفی کو کبھی پیار سے ڈانٹ کر اور کبھی صرف مسکرا کر ٹال دیتیں۔ اس خوب صورت رات کو
نے جی بھر کر ہنگامہ کیا اور خوب لطف اندوز ہوا۔

واپس گھر پہنچا تو رات کے تین بج رہے تھے۔ دروازہ اس کی بیوی نے کھولا۔ وہ ابھی تک
ل رہی تھی۔

سلمان پہلی بار اس کے سامنے شراب پی کر گیا تھا۔ عالم یہ تھا کہ کہتا کچھ تھا بات منہ سے نکلتی
تھی۔ جسم بے قابو ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے دھندلی دھندلی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔ اس
کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے۔ جھومتا جھامتا بستر پر جا کر اوندھے منہ گر پڑا اور اسی حالت میں پڑا
۔ تھوڑی دیر بعد اسے اپنے رخسار پر نمی محسوس ہوئی۔ وہ نشے سے چونکا ذرا دیر بعد چہرے پر ایک
نظر گرا۔

سلمان نے گردن کو خم دے کر دیکھا۔ بیوی اس پر جھکی ہوئی بیٹھی تھی۔ کمرے کی روشنی میں
کا دلکش چہرہ کملایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ سلمان نے گردن
ائی اور سوچنے لگا کہ اسے یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ اسے اس طرح اپنی بیوی کو دکھ نہیں پہنچانا
یے۔ ساتھ ہی مسرت بھی ہوئی کہ بیوی اس سے ٹوٹ کر پیار کرتی ہے۔ اس مسرت میں رات
کے سارے ہنگاموں سے زیادہ لذت تھی۔

(۲)

ہفتے کی شام تھی۔ سلمان دوپہر ہی کو دفتر سے گھر واپس آ گیا تھا۔ مہینے کی شروع تاریخیں تھیں۔

ل: شعور، احتیاط۔

سہ پہر کو چائے پیتے ہوئے دونوں میاں بیوی نے طے کیا کہ شام گھر سے باہر گزاری جائے۔ پروگرام یہ کہ کسی پر سکون ریستوران میں بیٹھ کر آئس کریم کھائی جائے۔ اس کے بعد فلم دیکھی جائے۔ فلم کے انتخاب پر دونوں کی پسند مختلف تھی۔ لہٰذا فیصلہ یہ ہوا کہ فلم کا انتخاب آئس کریم کھاتے وقت کیا جائے فلم دیکھنے کے بعد رات کا کھانا بھی باہر ہی کھانا تھا اور یہ طے ہوا کہ کھانا چاہے کسی بھی ہوٹل میں کھا جائے مگر اس میں سیخ کے کباب ضرور شامل ہوں۔ گرم ہوں اور چٹ پٹے ہوں۔

دونوں گھر سے باہر آئے۔

گرمی کا موسم تھا۔ دن ڈھلتے ہی شہر کی ساری آبادی سڑکوں اور بازاروں میں آگئی تھی۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ شور و غل تھا۔ دکانوں پر بھیڑ تھی۔ دونوں تفریح کے موڈ میں تھے اور بے فکری سے بازار سے گزر رہے تھے۔

ایک موڑ پر سلمان نے محسوس کیا کہ ایک نوجوان پوری توجہ سے اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ معمولی لباس پہنے ہوئے تھا۔ سر پر الجھے ہوئے گھونگھریالے بال، کھلتا ہوا رنگ اور چہرے پر ہلکی بھوری بھوری مونچھیں۔

سلمان کو پہلے تو اس کے انداز پر غصہ آیا۔ پھر ایسا معلوم ہوا کہ اسے کہیں دیکھا ضرور ہے سلمان کو شبہ ہوا کہ وہ نوشا ہے۔

وہ واقعی نوشا تھا اور اس نے سلمان کو پہچان لیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر ٹھٹکا۔ مگر یہ سوچ کر شرمندگی کا احساس ہوا کہ وہ گھر سے بھاگ کر کراچی آیا ہے۔ سلمان کو بھی اس کا علم ہوگا۔ ملے گا تو اس کا ذکر ضرور کرے گا اور اس کے متعلق وہ کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تیزی سے مڑا اور راہ گیروں کے ہجوم میں غائب ہو گیا۔

سلمان کو دیکھنے کے بعد نوشا کو اپنا گھر یاد آ گیا۔ اس نے سوچا۔ نہ جانے اماں کس طرح ہوں گی؟ سلطانہ کیسی ہوگی؟ انو تو اب بڑا ہو گیا ہوگا۔ ٹھاٹھ سے اسکول جاتا ہوگا۔ شاید اماں نے انو کو اسکول سے اٹھا کر کہیں کام دھندے پر لگا دیا ہوگا۔ اس کے اس طرح چلے آنے پر اماں ضرور رو رہی ہوں گی۔ اسے یاد آیا کہ ایک بار وہ گھر کی چھت پر چڑھتے ہوئے گر پڑا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ سارا چہرہ لہولہان ہو گیا تھا۔ اماں پہلے تو اسے دیکھ کر تھر تھر کانپتی رہیں اور پھر چیخ مار کر زور زور سے رونے لگی تھیں۔ اماں اس کے لیے ضرور روئی ہوں گی۔ سلطانہ بھی روئی ہوگی۔ سب اسے

رہے ہوں گے۔

اس روز وہ گھر سے ہشاش بشاش نکلا تھا۔ ایک روز پہلے اسے تنخواہ ملی تھی۔ اور ابھی تک اس جیب میں کچھ کم ۲۰ روپے پڑے تھے۔ کچھ دیر پہلے اس نے اپنے لیے دو سوتی بش شرٹوں کے علاوہ چند بنیان خریدی تھی۔ ٹافیوں کا ایک چھوٹا ڈبا اس نے یونہی موج میں آکر خرید لیا تھا۔ نادرہ کے لیے پلاسٹک کے خوبصورت آویزے بھی خریدے تھے۔ آویزے خریدتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ یار لڑکی کی بدولت کھانے کے علاوہ گرما گرم چائے بھی مل جاتی ہے۔ اسے راضی خوشی رکھنا بہت ضروری ہے۔ تمام خریداری پر اس کے ۲۵ سے زیادہ روپے خرچ ہوئے تھے۔ مگر وہ خوش تھا اور جھوم جھوم کر چل رہا تھا۔ لیکن سلمان کو دیکھ کر اس کا دل افسردہ ہو گیا۔ اسے گھر کی یاد ستانے لگی۔ بار بار خیال آتا کہ وہ کراچی میں عیش کر رہا ہے اور ادھر گھر پر نہ جانے سب کس حال میں ہوں گے؟ کیسے ہوں گے؟

اسی افسردگی کے عالم میں وہ واپس پہنچا۔ ملازم اپنے گھر جانے کے لیے اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ نوشا نے اسے رخصت کیا۔ دروازے کا بولٹ چڑھایا اور زینے کی سیڑھیاں طے کرتا اوپر چلا گیا۔ گھر میں سناٹا تھا پروفیسر کے کمرے میں روشنی تھی لیکن نوشا اس طرف نہیں گیا۔ غلام گردش سے گزر کر اس نے نادرہ کے کمرے کی جانب دیکھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ سامنے میز پر نادرہ سر جھکائے پڑھنے میں محو تھی۔ ٹیبل لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں اس کے چہرے کے خدوخال پتھر کے بتوں کی طرح ترشے ترشائے نظر آرہے تھے۔ ایک ایک زاویہ ایک ایک خم ابھر کر نمایاں ہو گیا تھا۔ کھڑکی کھلی تھی اور ہوا کے نرم نرم جھونکوں سے اس کے بال بکھر کر پیشانی پر لہرا رہے تھے۔

نوشا نے نظر بھر کر اسے دیکھا اور چپکے سے کمرے میں جا کر اس کی پشت پر کھڑا ہو گیا۔ نادرہ کو نوشا کی آمد کی ذرا بھی خبر نہ ہوئی۔ نوشا کچھ دیر تو خاموش کھڑا رہا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر میز کے اوپر پلاسٹک کے آویزے رکھ دیئے۔ تیز روشنی میں وہ خوبصورت نظر آنے لگے۔ نادرہ نے حیرت سے آویزے دیکھے۔ پھر گردن موڑ کر نوشا پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"تم نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا؟"

"تم اتنی دیر تک کہاں غائب رہے؟"

"ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد سیدھے گھر کیوں نہیں آئے؟"

اس نے نوشا پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ایک کے بعد دوسرا سوال کرتی چلی گئی۔ اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔ چہرے پر قدرے جھنجلاہٹ تھی۔ نوشا گھبرا گیا۔ کچھ کہتے نہ بن پڑی۔ خاموش کھڑا ٹکر ٹکر اس کا چہرہ تکتا رہا۔

"ابا جان کئی بار پوچھ چکے ہیں۔ تمہیں اس قدر غیر ذمہ دار نہیں ہونا چاہیے۔"

نوشا نے سوچا۔ یار یہ تو بلا کی طرح چمٹ گئی۔ سالی بڑی تیز لونڈیا ہے۔ ایسے طمطراق سے بات کرتی ہے جیسے ماں بچے کو ڈانٹ رہی ہو۔ مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ چپ چاپ احمقوں کی طرح آنکھیں پھاڑے اس کی باتیں سنتا رہا۔ نادرہ نے آویزے الٹ پلٹ کر دیکھے اور تیزی سے بولی۔

"یہ کیوں لے آئے؟"

نوشا پھر بھی نہ بولا۔

"میں پوچھتی ہوں کہ تم نے یہ ٹاپس کیوں خریدے؟"

نوشا نے گھبرا کر کہا۔ "تمہارے لیے لایا تھا۔"

وہ آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ "میرے لیے؟" اس کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ "جناب عالی میرے پاس ایک درجن سے زیادہ کانوں کے ٹاپس ہیں اور ذرا آپ اپنی یہ قمیص ملاحظہ فرمایئے موبل آئل کے داغوں نے جیسے ہر جگہ جنگل اگا دیے ہیں۔ اور آپ کی یہ اکلوتی قمیص ہے۔"

نوشا نے فوراً وضاحت کی۔ "دو بش شرٹیں بھی تو لایا ہوں۔" اس نے ہاتھ میں دبا ہوا پیکٹ کھولا اور اس کے سامنے ڈال دیا۔

نادرہ نے بش شرٹوں کو ایک نظر دیکھا اور آویزوں کی ڈبیا اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دی۔

"آئندہ کوئی ایسی چیز خرید کر نہ لانا۔ اسے اپنے پاس رکھو۔ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

نوشا کو اس کا یہ انداز بہت ناگوار گزرا۔ اس نے بجھی بجھی نظروں سے اسے دیکھا اور آویزوں کی ڈبیا اٹھالی۔ جب وہ جانے لگا تو نادرہ نے پوچھا۔

"تم نے کھانا کہاں کھایا؟"

نوشا بے رخی سے بولا۔ "کہیں نہیں۔"

"تو پھر چلو کھانا کھالو۔"

بلا: بذیل۔ طمطراق: رعب، غرور۔ زہر خند: طنزیہ ہنسی۔

وہ منہ پھلا کر بولا۔ "میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

وہ اس وقت کسی ضدی بچے کی طرح روٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ نادرہ نے خاموشی سے اسے دیکھا کوئی بات نہیں کی۔ نوشا جھنجلایا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ تھکے تھکے قدموں سے زینہ طے کیا اور کمرے میں چلا گیا۔

بستر پر لیٹ کر وہ دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ نادرہ کے رویے سے اس کے دل کو ٹھیس پہنچی تھی۔ وہ اس کے لیے خوشی خوشی آویزے خرید کر لایا تھا۔ اور اس نے اس حقارت سے واپس کر دیا کہ وہ تلملا کر رہ گیا نوشا کو محسوس ہوا کہ وہ اسے گھٹیا اور حقیر سمجھتی ہے۔ وہ بڑا دل اور زود رنج تھا۔ یہ بات کانٹے کی طرح اس کے ذہن میں کھٹکنے لگی۔ بہت دیر تک وہ اس واقعے پر کڑھتا رہا اور بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

نہ جانے رات کتنی گزر چکی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ نوشا کی آنکھوں پر ہلکی ہلکی غنودگی طاری تھی۔ کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ ابھری۔ پھر اندھیرے میں ایک سایہ سا لہرایا جیسے اپنے سرہانے کسی کیا آہستہ آہستہ سانس بھرنے کی آواز سنائی دی۔ نوشا نے آنکھیں کھول اور اندھیرے میں گھورنے لگا۔ ایک نرم نرم ہاتھ اس کے کندھے پر آ کر ٹک گیا۔ ساتھ ہی آئی۔

"نوشا!"

یہ نادرہ تھی وہ آہستہ آہستہ اسے جھنجھوڑ کر بیدار کر رہی تھی۔ نوشا دم بخود پڑا رہا۔ اس نے نادرہ اس وقت اس کے پاس کیوں آئی ہے؟ جب نادرہ نے کئی بار جھنجھوڑا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گھبراتا ہوا بولا۔ "نادرہ۔"

"ہاں!" اس نے مختصر جواب دیا۔

"کیا بات ہے؟" نوشا نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

وہ نرم لہجے میں بولی۔ "کھانا کھالو۔ تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔"

نوشا نے اٹھ کر بجلی کا سوئچ دبا دیا۔ کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی۔ اس نے دیکھا۔ نادرہ کھانا لے آئی تھی۔ اس نے کھانے کی پلیٹیں پلنگ پر رکھ دیں اور خود بھی بستر کے ایک کنارے پر بیٹھ گئی۔

بیمار، مریض ہو جانے والا۔

"جاؤ ہاتھ دھو کر آؤ اور کھانا کھالو۔"

نوشا سدھے ہوئے جانور کی طرح چپ چاپ غسل خانے میں گیا۔ ہاتھ دھوئے اور کمرے میں آکر کھانا کھانے لگا۔ اسے خاموش دیکھ کر نادرہ بولی۔ "لاؤ وہ ٹاپس کی ڈبیا کہاں ہے؟" نوشا نے تکیے کے نیچے سے ڈبیا نکال کر اسے دے دی۔

ڈبیا لے کر وہ بولی۔ "دیکھو اب کوئی ایسی چیز نہ خریدنا تمہیں خود ابھی بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے۔"

نوشا سر جھکائے کھانا کھاتا رہا۔

وہ کہتی رہی۔ "معلوم ہوتا ہے تم نے میری بات کا بہت برا مانا۔" وہ زیر لب مسکرائی۔ "میں تم کو سزا دینا چاہتی تھی۔ دیکھو نا یہ کتنی بے تکی سی بات ہے۔"

نوشا کو اس میں کوئی بے تکا پن نہ معلوم ہوا اس نے کسی قدر تعجب سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے اس طرح گردن اٹھائے بیٹھی تھی جیسے کوئی استاد اپنے شاگرد کے روبرو بیٹھا ہو۔ جب نوشا کھانا کھا چکا تو وہ پلیٹیں اٹھا کر اوپر جانے لگی نوشا نے چاہا کہ پلیٹیں وہ خود اٹھا کر لے جائے تو وہ ڈانٹنے کے سے انداز میں بولی۔

"خواہ مخواہ تکلف مت کرو۔ تم کو صبح تڑکے جانا ہے۔ جلدی سو جاؤ۔"

وہ کھٹ پٹ کرتی کمرے سے باہر چلی گئی۔ نوشا خاموش بیٹھا لکڑی کے زینے پر اس کے قدموں کی آہٹ سنتا رہا۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ نادرہ ہمیشہ نوشا سے اسی طرح پیش آتی تھی۔ عمر میں لگ بھگ دو سال کے برابر ہی تھی مگر اس کا رویہ بزرگوں کا سا تھا۔ وہ بات بات پر اس سے باز پرس کرتی۔

"نوشا! تم صبح دیر سے کیوں اٹھتے ہو؟"

"نوشا! تمہارے دانت اتنے گندے کیوں ہیں؟ دونوں وقت دانت صاف کیا کرو۔"

"نوشا! تم ایکٹروں کے سے بال مت بنایا کرو۔ بالکل لوفر لگتے ہو۔"

"نوشا! تم نے پھر غلط زبان بولی۔ فلاشمین قطعی مہمل لفظ ہے۔"

وہ ہر وقت اسے ٹوکتی رہتی۔ نوشا تم نے یہ نہیں کیا۔ نوشا تم نے وہ نہیں کیا۔

سدھے ہوئے: تربیت یافتہ۔ لوفر: آوارہ۔ مہمل: بے معنی۔

شروع شروع میں تو نوشا نے اس رویے کے خلاف احتجاج کرنے کی بھی کوشش کی لیکن رفتہ رفتہ مانوس ہوتا گیا۔

اس ڈانٹ ڈپٹ اور روک ٹوک کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس میں خاصی شائستگی پیدا ہو گئی۔ اب وہ بے پن سے قہقہہ نہیں لگاتا تھا۔ بات کرتا تو سنبھل سنبھل کر بولتا۔ پہلے اس کی وضع قطع فلم روں کی سی تھی۔ اب اس نے بال چھوٹے کرا دیئے تھے۔ پتلون کی موریاں الٹ کر چڑھانا چھوڑ نیں۔ رات کو مزے میں آکر کبھی کبھی وہ کوئی فلمی دھن گنگنانے لگتا تھا۔ اب ایسی کوئی آواز اس کرے سے نہیں ابھرتی تھی۔

❁ ❁ ❁

پروفیسر سے نوشا کی ملاقات صرف ناشتے کی میز پر ہوتی۔ مگر اس وقت بھی وہ اخبار پڑھنے میں ہوتا۔ بات چیت کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ کبھی کبھار اتفاق سے اس کا نوشا سے آمنا سامنا ہو جاتا طرح کھویا کھویا گزر جاتا جیسے اسے دیکھا ہی نہیں۔

ایک روز پروفیسر کو نہ جانے کیا سوجھی۔ اچانک نوشا کے کمرے میں آگیا اور آتے ہی بولا۔ نے ابھی ابھی سوچا کہ تم کو کسی اسکول میں داخلہ لے لینا چاہیے۔"

نوشا نے دبی زبان سے کہا۔ "میں کام کرنے گیراج جو جاتا ہوں۔"

"بہت ٹھیک بات کہی تم نے۔ میں یہ بھول ہی گیا تھا۔ نائٹ اسکول کیسا رہے گا؟ مگر نائٹ ا تو یہاں سب واہیات ہیں۔ ایک صاحب کو میں جانتا ہوں جو رات کو اسکول چلاتے ہیں اور دن ٹی ایٹی کرتے ہیں۔ نائٹ اسکول اور قرق ایٹی میں قدرِ مشترک کیا ہے؟ یہ مسئلہ آج تک میں نہیں کر سکا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تعلیم دینے کے بجائے طلبا کے ذہن قرق کرتے ہوں گے۔"

ت پر وہ خود ہی ہنس پڑا۔

نوشا خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

"کوئی وجہ نہیں کہ تم انجینئر نہ بنو۔ مگر تعلیم کا مسئلہ، مگر تعلیم کا مسئلہ۔" وہ بے خیالی میں آہستہ بڑبڑانے لگا۔ پھر چونک کر گویا ہوا۔

"تم گیراج کی ملازمت کیوں نہ چھوڑ دو؟"

ٹیر۔ بھوڑا پھنسی: بے تکا انداز، بدتمیزی۔ قدرِ مشترک: مشترک بات۔

نوشا نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے بولنے کا موقع نہ دیا۔ "نہیں۔ تمہیں ضرور کچھ نہ کچھ کہنا رہنا چاہیے۔ ورنہ زندگی بھر احساس کمتری میں مبتلا رہو گے۔ کچھ اور سوچنا پڑے گا۔" یہ کہتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

ایک عرصے تک نوشا سے پروفیسر کی ملاقات نہیں ہوئی۔

نادرہ بھی اپنے باپ کی طرح عجیب و غریب لڑکی تھی۔ ذرا سی بات پر اس کی بھویں تن جاتیں۔ آنکھوں میں تیز چمک آجاتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ نوشا جھنجلا کر کوئی الٹی سیدھی بات کہہ دیتا تو مسکرا کر چپ ہو جاتی۔ ایک دن تو اس نے کمال کر دیا۔ نوشا نے شوخ رنگ کی بش شرٹ خریدی تھی۔ اس پر فلمی اداکاراؤں کی رنگ برنگی اور ہیجان انگیز تصاویر چھپی تھیں۔ وہ اسے پہن کر نادرہ کے سامنے سے گزرا تو اس نے ٹوکا۔

"نوشا تمہارا مذاق بڑا گھٹیا ہے۔"

نوشا اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ کہنے لگا۔ "کیوں، کیا ہوا؟"

وہ بولی۔ "یہ بش شرٹ پہن کر تم پلے بوائے سے زیادہ لائف بوائے صابن کا ٹریڈ مارک معلوم ہوتے ہو۔"

نوشا کو تاؤ تو بہت آیا مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ وہ اس کا مذاق اڑاتی رہی۔ "اس لباس میں تم بالکل لو معلوم ہوتے ہو اور وہ بھی تیسرے درجے کے۔"

نوشا کو اس روز وہ کئی بار ڈانٹ پھٹکار چکی تھی۔ وہ پہلے ہی جھنجھلایا ہوا تھا۔ جل کر بولا۔ "تم یہ روزانہ الٹے سیدھے بال بناتی ہو اور نہ جانے کیسی آڑی ترچھی قمیصیں اور فراکیں پہنتی ہو تو نے کبھی یہ نہیں کہا تم بالکل چڑی کی بیگم لگتی ہو۔ ایک دم چڑی کی بیگم۔"

کہنے کو تو غصے میں نوشا نے جو منہ میں آیا کہہ دیا۔ مگر فوراً سہم گیا۔ اس نے سوچا اب شامت آگئی۔ مگر نادرہ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگی اور جب نوشا جانے لگا تو اسے روک کر نرم لہجے میں بولی۔

"معاف کرنا نوشا! مجھے تم سے ایسی بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔ میں اپنی غلطی کی معافی چاہتی ہوں۔"

نوشا ہکا بکا ہو کر اس کا منہ تکنے لگا اور وہ بار بار معذرت کرتی رہی۔

یہ اور ایسی ہی بہت سی باتیں تھیں جن سے وہ بالکل اندازہ نہ لگا سکا کہ وہ کس قسم کی لڑکی ہے

اس کی ماں سیدھی سادی گھریلو سی عورت تھی۔ اس کا نام عارفہ بیگم تھا۔ اسے گٹھیا کا عارضہ تھا۔ کبھی کبھی درد گردہ کا بھی دورہ پڑتا۔ وہ بیشتر وقت بستر پر پڑی رہتی۔ جب نوشا پہلے پہل اس گھر میں آیا اس نے بڑی ناک بھوں چڑھائی۔ اس سے سیدھے منہ بات تک نہیں کی۔ ممکن ہے اس کے شوہر سے شکایت بھی کی ہو۔ مگر وہ جلد ہی نوشا سے مانوس ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نوشا مستعدی سے اس کی خدمت کرتا تھا۔ وہ گھنٹوں بیٹھا اس کے پیروں پر مالش کیا کرتا۔ اس کا سر کھجاتا، دھو ڈھونڈ کر اس کے لیے دوائیں اور انجکشن لاتا۔

نوشا اکثر رات کو کھانا کھانے کے بعد عارفہ بیگم کے کمرے میں پہنچ جاتا۔ سرہانے بیٹھا اس کا دل بہلایا کرتا اور گھنٹوں باتیں کیا کرتا۔ اس کی باتیں سیدھی سادی عام گھریلو قسم کی ہوتی تھیں۔ ان میں کچھ ماضی کی یادیں ہوتیں۔ عزیزوں اور رشتے داروں کا تذکرہ ہوتا۔ کسی کی غیبت اور کسی کی شکایت ہوتی اور شوہر کے خلاف گلے شکوے ہوتے۔ پروفیسر سے اسے بہت سی شکایتیں تھیں۔ یہ شکایتیں معمولی اور عام سی باتیں تھیں جن کو نہ کبھی پروفیسر کلیم اللہ سننے کی زحمت گوارہ کرتا تھا اور نہ کبھی توجہ دیتی تھی۔ نوشا ہی گھر بھر میں ایک ایسا فرد تھا جو عارفہ بیگم کی ہر بات چپ چاپ بیٹھا سنا کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ اب وہ اسے بڑا اچھا لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ بہت سعادت مند اور فرمانبردار۔ کبھی جب وہ کمرے سے اٹھ کر جاتا تو وہ دیر تک بڑی بوڑھیوں کی طرح اسے دعائیں دیتی رہتی۔

❁ ❁ ❁

نوشا اب پروفیسر کلیم اللہ کے کنبے کا ایک فرد بن چکا تھا۔ شروع شروع میں جو جھجک اور عار محسوس کرتا تھا، اب ختم ہو چکا تھا۔ کبھی کھانے میں دیر ہو جاتی تو وہ بڑی بے تکلفی سے آواز لگاتا۔ "بھئی مانو شہر بھر کے سارے چوہے میرے پیٹ میں گھس گئے ہیں اور خوب اودھم دھاڑ مچا رہے ہیں"

اسی طرح جب اس کی قمیصوں کے بٹن ٹوٹ جاتے یا کوئی کپڑا پھٹ جاتا تو وہ نادرہ کے سر پر سوار ہو کر اسے درست کرواتا۔ کبھی خوشامد کرتا کبھی ناگواری سے منہ بگاڑتا اور اپنا کام کروائے بغیر ٹلتا۔ البتہ پروفیسر کلیم اللہ کو وہ اب تک نہ سمجھ سکا تھا۔ وہ پہلے بھی اس کے لیے معمہ تھا اور اب بھی معمہ تھا۔

وہ بھلکڑ اور غائب دماغ ہونے کے ساتھ ساتھ خبطی اور سنکی بھی تھا۔ ہر وقت کھویا کھویا رہتا

گٹھیا: گٹھیا کا درد۔ عارضہ: مرض۔ مستعدی: تیزی، ہوشیاری۔ غیبت: کسی کے پیٹھ پیچھے برا کہنا۔ عار: شرم۔ اودھم دھاڑ: شور شرابہ۔ خبطی: بھول جانے والا۔ خبطی: دیوانہ، سودائی۔ سنکی: جنونی۔

اور اکثر اوٹ پٹانگ باتیں کرتا۔ بیوی کا کہنا تھا کہ وہ پہلے ایسا نہ تھا۔ اس کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ اسے ذرا بھی تکلیف ہوتی تو بے چین ہو جاتا۔ طرح طرح سے اس کی دل جوئی کرتا۔ بچوں سے بھی ٹوٹ کر محبت کرتا تھا اور پہلوٹی کے بیٹے سلیم اللہ کی چاہت کا تو یہ عالم تھا کہ اسے دیکھ کر نہال ہو جاتا۔ ہر طرح اس کی ناز برداری کرتا۔ اس کا مستقبل سنوارنے کے لیے نت نئے منصوبے بناتا رہتا۔ اس کی تعلیم اور تربیت پر پوری توجہ صرف کرتا۔ سلیم اللہ ذہین اور ہونہار طالب علم تھا۔ صحت مند اور خوش شکل تھا۔ ڈاؤ میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا۔ ایم بی بی ایس کا تیسرا ہی سال تھا کہ پروفیسر کلیم اللہ نے اسے لاڈ میں ڈاکٹر کہنا شروع کر دیا تھا۔ انہی دنوں وہ اپنے چند ہم جماعت طلباء کے ساتھ ایک روز سینڈس پٹ پر پکنک منانے گیا۔ سمندر میں نہاتے ہوئے بپھری ہوئی سرکش لہروں میں ایسا گم ہوا کہ دوسرے روز غوطہ خوروں کی سخت جدوجہد کے بعد اس کی لاش ملی۔ اس دل خراش سانحے سے ایسا شدید صدمہ پہنچا کہ پروفیسر کلیم اللہ ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ گھنٹوں بت بنا خاموش بیٹھا رہتا۔ بہکی بہکی باتیں کرتا۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر گھر سے نکل جاتا۔ بیٹے کے انتقال کو کئی سال ہو گئے تھے مگر اس کے دماغ کی چولیں ایسی ڈھیلی ہوئیں کہ وہ سنبھل نہ سکا۔ ہولو اور خبطی ہو گیا۔

مگر نوشا کے لیے وہ فرشتہ رحمت سے کم نہ تھا۔ وہ اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ محلے کے ایک شخص نے، جو محکمہ زراعت میں چپراسی تھا، کسی بات پر پروفیسر کو الو کا پٹھا کہہ دیا۔ نوشا ایسا تاؤ آیا کہ ایک لمحے بھی انتظار نہ کیا۔ تابڑ توڑ اس کے جبڑے پر کئی مکے جڑ دیئے۔ اس کے ہونٹوں سے خون رسنے لگا اور وہ چکرا کر گر پڑا۔ پاس پڑوس میں کھلبلی مچ گئی۔ خاصا ہنگامہ ہوا۔ بات پروفیسر تک پہنچی۔ اس نے فوراً اس شخص کے پاس جا کر باقاعدہ معافی مانگی اور دس روپے اصرار کر کے تاوان بھی دیا۔ نوشا ڈرا کہ اب وہ اس پر ناراض ہوگا۔ مگر اس نے نوشا سے صرف اس قدر کہا۔

"تمہارے متعلق مجھے اپنی رائے بدلنی پڑے گی۔ تمہیں انجینئر کی بجائے فوجی بننا چاہیے مجھے تمہاری اسپرٹ پسند آئی۔"

وہ دیر تک اس کی پیٹھ تھپک کر شاباشی دیتا رہا۔

پہلوٹی کا بچہ: پہلا بچہ۔ دل خراش: تکلیف دہ۔ تاوان: جرمانہ۔ اسپرٹ: طاقت، تیزی۔

موسم گرما کی سنسان دوپہر تھی۔ ہر طرف بگولے منڈلا رہے تھے۔ غبار میں ڈھکی ہوئی ہر شے اونگھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ سلطانہ کمرے میں تھکی ہوئی لیٹی تھی۔ دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ وہ بہت ہلکا لباس پہنے تھی۔ اس کے برہنہ بازو تکیے پر جھول رہے تھے چہرے پر ہلکی زردی تھی اور آنکھیں دھلی دھلی سی معلوم ہو رہی تھیں۔

مہینہ بھر تک اسپتال میں رہنے کے بعد وہ پچھلے ہفتے واپس آئی تھی۔ اس کے برابر ہی پالنے میں ایک ننھا سا بچہ آنکھیں بند کئے سو رہا تھا۔ یہ اس کا بچہ تھا اس کا چہرہ نیاز کی طرح چوڑا تھا۔ ناک کے نتھنے ابھرے ہوئے تھے اور دہانہ بڑا تھا۔ اس بچے کی پیدائش میں وہ اٹھارہ گھنٹے تک لیبر روم میں بجلی کی طرح تڑپتی رہی اور موت اور زندگی کے درمیان ہچکولے کھاتی رہی۔

وہ رات کے ۴ بجے پیدا ہوا تھا اس روز شام ہی سے سلطانہ کی حالت غیر تھی۔ اس پر بار بار غشی کا دورہ پڑ رہا تھا۔ ۱۲ بجے تک اس کی نبضیں ڈوبنے لگی تھیں۔ جسم پسینے سے شرابور ہو گیا اور چہرے پر ہوائیاں منڈلانے لگی۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر لیڈی ڈاکٹر نے گھبرا کر نیاز کو ٹیلی فون کیا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اس رات اس نے شراب زیادہ پی لی تھی۔ مدہوش پڑا تھا۔ بہت دیر بعد اس نے ٹیلیفون اٹھایا اور یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا کہ وہ صبح سے پہلے اسپتال نہیں آسکتا۔ نرس نے کئی بار نمبر ملایا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی رہی مگر نیاز ایسا کروٹ بدل کر سویا کہ پھر آنکھ ہی نہ کھلی۔

چار بجے تک سلطانہ پر نزع کی حالت طاری رہی۔ بچے کی پیدائش کے بعد بھی اسے ہوش نہیں آیا تھا۔ اس کے جسم میں دو بوتل خون داخل کیا گیا۔ نیاز آٹھ بجے صبح اسپتال پہنچا۔ بچے کی پیدائش پر وہ بہت خوش تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ مریضہ کے پاس جا کر بچے کو ایک نظر دیکھ لے۔ مگر اسے گھنٹہ بھر تک انتظار کرنا پڑا۔ وہ تمام وقت وارڈ کے باہر بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ جب نرس نے بچہ اسے لا کر دکھایا تو اس نے جھک کر بچے کو بے ساختہ چوم لیا۔

جب تک سلطانہ اسپتال میں رہی وہ پابندی سے اسے دیکھنے جاتا۔ دن میں کئی کئی بار ٹیلیفون

نزع کی حالت: دم نکلنے کی حالت۔ پالنا: بچوں کا جھولا۔

کرتا اور ہر بار بچے کے متعلق کچھ نہ کچھ پوچھتا۔ اسے اپنے بچے سے بے حد پیار تھا۔ گھر میں واپس آ
سلطانہ نے دیکھا کہ نیاز نے بچے کے لیے ڈھیر سارے کھلونے لا کر اکٹھا کر دیے تھے۔ صبح اٹھتے ہی
سلطانہ کے کمرے میں آتا۔ بچے کی پیشانی کو بوسہ دیتا اور دیر تک اس کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ رات
واپس آتا تو ایک بار بچے کو ضرور پیار کرتا۔ اگر وہ جاگتا ہوتا تو پالنے کے قریب بیٹھ کر عجیب و غریب
آوازیں نکال کر اسے ہنسانے کی کوشش کرتا۔

سلطانہ خوش تھی کہ نیاز بچے سے اس قدر پیار کرتا ہے۔ وہ خود بھی اسے بہت چاہتی تھی۔ ا
نے اپنی جان کی بازی لگا کر اسے جنم دیا تھا۔ حالانکہ بچے کی پیدائش سے پہلے اکثر سوچا کرتی تھی کہ
اسے ماں کی مامتا نہ دے سکے گی۔ سلطانہ کو اس کے خیال ہی سے نفرت ہوتی تھی۔ ایک روز جب
راز افشا ہوا کہ وہ حاملہ ہے تو تمام دن روتی رہی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اس کی نفرت بڑھتی گ
وہ جل کر کبھی کبھی اسے کوسنے لگتی۔ "یا اللہ! یہ حرامی پیدا ہوتے ہی مر جائے۔" اسی کوفت میں وہ
ہو گئی۔ جسم لاغر پڑ گیا۔ ان دنوں وہ ذرا ذرا سی بات پر نیاز کو جھڑک دیتی۔ بلیوں کی طرح غرا کر ا
آنکھیں نکالتی اور گھنٹوں بند کمرے میں بیٹھی رویا کرتی۔ یوں بھی اس کا بیشتر وقت کمرے کے اندر
گزرتا تھا۔ وہ بہت ہی کم باہر نکلتی۔ گھر کے نوکروں تک کے سامنے آتے ہوئے خوف معلوم ہوتا

اس نے سوچا تھا کہ پیدائش کے فوراً ہی بعد گلا گھونٹ کر چپکے سے اسے ختم کر دے گی۔ ا
اب یہ حالت تھی کہ اسے دیکھ کر جی رہی تھی۔ وہ ہر وقت بچے ہی کے کسی نہ کسی کام میں منہمک
رہتی۔ اسی کی بدولت وہ اب نیاز میں بھی دلچسپی لینے لگی تھی۔ ورنہ اس نے ہمیشہ نیاز کی قربت
بیزاری محسوس کی تھی۔ وہ اس سے بہت کم بات کرتی تھی۔ کبھی بولتی بھی تو اس میں تلخی ہوا
حقارت ہوتی اور دبی دبی سی نفرت۔ مگر اب یہ ہوتا کہ نیاز جب صبح ہی صبح بچے کو دیکھنے کمرے میں
تو وہ دیر تک نیاز کے پہلو میں بیٹھی باتیں کیا کرتی۔ وہ نیاز سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ بچہ ان
تعلقات کے درمیان مضبوط کڑی بن گیا تھا۔

❁ ❁ ❁

گرمی اور بڑھ گئی تھی۔ در و دیوار انگاروں کی طرح تپتے۔ باہر احاطے میں خشک پتے دن
کھڑکھڑاتے۔

راز افشا ہونا: بھید کھل جانا، راز ظاہر ہونا۔

ایک روز بڑی زور کی آندھی آئی۔ آسمان کا رنگ سرخ پڑ گیا۔ درختوں کی شاخیں چیخ چیخ کر رونے لگیں۔ کھڑکیوں کے شیشے چھن چھن ٹوٹنے لگے۔ آندھی کا زور ٹوٹا تو موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

اس طوفان سے بڑا نقصان ہوا۔

بجلی کے تار جگہ جگہ سے ٹوٹ گئے۔ شام کا وقت تھا۔ سارا شہر تاریکی میں ڈوبا ہوا کسی کھنڈر کی طرح ہیبت ناک نظر آتا تھا۔

تیز بارش سے جہاں اور بہت سا نقصان ہوا، اس میں میونسپلٹی کا نیا مارکیٹ بھی شامل تھا۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی۔ نیچے بازار تھا۔ اوپر کی منزل میں رہائشی فلیٹ تھے۔ بڑے زور کا دھماکہ ہوا اور عمارت کے ایک حصے کی چھت ٹوٹ کر نیچے آ گئی۔ کئی دیواریں شق ہو کر منہدم ہو گئیں۔

ہر طرف کہرام مچ گیا۔ اوپر فلیٹوں میں رہنے والوں میں سے کئی خاندان پورے کے پورے ملبے تلے دب کر گور ہو گئے۔ بڑا برا وقت تھا۔ گہرا اندھیرا پھیلا تھا۔ بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ فائر بریگیڈ والے رات بھر ملبے سے زخمیوں کو نکالتے رہے۔ بارہ افراد اسی وقت ہلاک ہو گئے تھے جن میں ۴ بچے اور ۳ عورتوں کی لاشیں بھی شامل تھیں۔ ۵۵ زخمیوں کو نکال کر اسپتال پہنچایا گیا۔ بعض کی حالت بہت نازک تھی۔

دوسرے روز اخبارات نے سیاہ حاشیوں کے ساتھ اس خبر کو شائع کیا۔ اداریوں میں اس المناک سانحہ کی تحقیقات کا مطالبہ کیا گیا اور میونسپلٹی کے ذمہ دار حکام کے خلاف سخت اعتراضات کئے گئے۔

میونسپلٹی میں ایک گروپ خان بہادر کے مخالفین کا بھی تھا۔ انہوں نے اس حادثے کی آڑ لے کر ایسے بیانات جاری کئے جن میں خان بہادر پر بحیثیت چیئرمین بہت سنگین الزامات لگائے گئے تھے۔

شہریوں کی جانب سے احتجاجی جلسہ بھی ہوا جس میں بڑی اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں۔ ان مقررین نے کھلم کھلا نیاز کا نام لیا۔ اس لیے کہ مارکیٹ کی تعمیر کا ٹھیکیدار وہی تھا۔ صوبائی حکومت عوامی احتجاج سے مرعوب ہو کر اسپیشل پولیس کے ایک سینئر افسر کی نگرانی میں فوراً تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دی۔ خان بہادر پہلے ہی کیا کم پریشان تھا، اس اطلاع نے اسے اور سراسیمہ کر دیا۔ معاملہ بہت سنگین

لغات: پھٹنا، شگاف پڑنا۔ منہدم ہونا: مسمار ہونا، گرنا۔ زندہ درگور: زندہ دفن۔ اشتعال انگیز: جوشیلی، غصیلی۔ سراسیمہ: پریشان۔

ہو گیا تھا اور مخالفین تلے ہوئے تھے کہ اسے چیئرمین کے عہدے سے ہٹائے بغیر نہ رہیں گے۔

خان بہادر نے اس صورتحال سے گھبرا کر میونسپلٹی کا ہنگامی اجلاس طلب کیا اور ساری ذمہ داری نیاز پر ڈال دی۔ اس طرح عدم اعتماد کی تحریک اس کے خلاف کارگر نہ ہو سکی۔ مخالفین کو منہ کی کھانا پڑی۔

میونسپلٹی کی جانب سے مطمئن ہونے کے بعد وہ تحقیقاتی کمیٹی کی طرف متوجہ ہوا۔ جو پولیس افسر اس کا نگراں مقرر ہوا تھا اس کے متعلق چھان بین شروع کی۔ معلوم ہوا کہ وہ عنقریب ریٹائر ہونے والا ہے۔ خان بہادر کو یہ اطلاع ملی تو ہاتھ اونچا کر کے بولا۔

"بس اب کام بن گیا۔"

خان بہادر اس افسر سے ملا۔ آدمی تجربہ کار تھا۔ اس کی باتوں سے تھوڑی ہی دیر میں خان بہادر کو اندازہ ہو گیا کہ معاملہ بن سکتا ہے۔ اس نے ۲۰ ہزار روپے مخمل کے ڈبے میں رکھ کر اسے "نذرانہ" دیا اور بقول شخصے مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا اپنے گھر چلا آیا۔

تحقیقات ہوتی رہی۔ خان بہادر حسب معمول روزانہ شام کو اسکاچ کے تین چار پیگ چڑھاتا اور رات گئے تک رمی کھیلتا۔ البتہ نیاز کی آمد و رفت اس نے اپنے یہاں بالکل بند کرا دی اور یہ مشورہ دیا کہ کچھ عرصے کے لیے وہ شہر سے باہر چلا جائے۔ نیاز پہلے تو تیار ہو گیا۔ پھر اس کی سمجھ میں خود ہی یہ بات آ گئی کہ غیر حاضری سے خواہ مخواہ شبہ پیدا ہو گا۔ لہٰذا اس نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

نیاز کے لیے یہ بڑی پریشانی کے دن تھے۔ وہ گھر میں بہت کم رہتا۔ دوڑ دوڑ کے ان ٹھیکے داروں کے پاس جاتا جن کے ذریعہ اس نے مارکیٹ بنوائی تھی۔ گھر میں جتنی دیر رہتا کھویا کھویا سا بے چینی کے عالم میں ٹہلتا رہتا۔ اکثر رات گئے بستر سے اٹھ کر سلطانہ کے پاس آتا اور اس سے اوٹ پٹانگ باتیں شروع کر دیتا۔

❀ ❀ ❀

نیاز ایک رات سلطانہ کے پاس کمرے میں بیٹھا تھا۔

باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ بادل زور زور سے گرج رہے تھے۔ بچہ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ وہ ہمک ہمک کر نیاز کی جانب دیکھ رہا تھا۔ لیکن نیاز بڑا افسردہ تھا۔ سلطانہ نے دل جوئی کی کوشش کی۔ بچے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"اپنی پریشانی میں آپ نے ننھے کو بھی بھلادیا۔ دیکھئے تو آپ کو کس طرح دیکھ رہا ہے"
نیاز نے بچے کو گود میں اٹھالیا اور اس کا رخسار چوم کر بولا۔ "بیٹا تمہارے باپ کو سزا ہو گئی تو
م کس کے ساتھ کھیلو گے؟"
سلطانہ نے فوراً کہا۔ "آپ پر تو آج کل یہی بھوت سوار ہے۔"
نیاز مسکرا کر چپ ہو گیا۔ سلطانہ کچھ کہنے ہی جارہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی زور زور سے
جے لگی۔ نیاز نے بچے کو سلطانہ کی گود میں دیا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔ برساتی میں پولیس کی گاڑی کھڑی
ی۔ ایک انسپکٹر اور کئی مسلح کانسٹیبل دروازے پر موجود تھے۔ وہ گرفتاری کے وارنٹ لے کر آئے
ے۔ انہوں نے اسی وقت اسے حراست میں لے لیا اور گاڑی میں بٹھا کر اپنے ہمراہ لے گئے۔
نیاز کی گرفتاری کی اطلاع ملی تو خان بہادر گھبرا گیا۔ اس نے جو اسکیم تیار کی تھی اس میں نیاز کی
رفتاری کے پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ خطرہ یہ درپیش تھا کہ مارکیٹ کے ٹھیکے سے جو منافع ہوا
ا اس میں سے ۸۰ ہزار روپے خان بہادر کے حصے میں بھی آئے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے جو
اں فیکٹری لگائی تھی اس کی تعمیر میں سیمنٹ اور لوہا بھی مارکیٹ ہی کے کوٹے سے گیا تھا۔ یہ سارا
م نیاز ہی کے ذریعے ہوا تھا۔ اس نے سوچا نیاز کہیں گھبرا کر سب کچھ صاف صاف نہ اگل دے۔
ی صورت میں اس کے پھنس جانے کا قطعی امکان تھا۔
پہلی بار خان بہادر کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ دراصل کترانے کے بجائے اسے نیاز کو اپنے
ے میں رکھنا چاہیے تھا۔ بہر حال اب جو کچھ ہو چکا تھا اس کا تدارک ضروری تھا۔ چنانچہ چند ہی روز
د اس نے دوڑ دھوپ کر کے نیاز کو ضمانت پر رہا کرالیا۔
دوسرے مہینے تحقیقاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ حکومت کو دے دی۔ رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ
ارکیٹ کی تعمیر میں جو مٹیریل استعمال کیا گیا تھا وہ بہت ناقص اور غیر معیاری تھا مزید براں سیمنٹ کا
سب بہت کم تھا۔ اس کمی کو ریت اور بجری سے پورا کیا گیا تھا۔ چھتوں پر کنکریٹ برائے نام ڈالی گئی
ا لوہا ضرورت سے بہت کم استعمال کیا گیا تھا۔ یہ سارے الزامات نیاز کے خلاف تھے۔
تحقیقاتی کمیٹی نے حکومت سے پرزور سفارش کی تھی کہ ٹھیکیدار کے خلاف سخت کارروائی کی
ائے۔ اس کی بدعنوانیوں کے باعث ۱۲ شہریوں کی قیمتی جانیں تلف ہوئی تھیں۔ سات افراد اپنے

۱؎ بچاؤ۔ تدارک: روک تھام۔

جسموں کے اکثر اعضاء ضائع کر کے اپاہج ہو گئے اور لاکھوں روپے کا مالی نقصان ہوا۔

رپورٹ میں جگہ جگہ نیاز کے خلاف ٹھیکیدار کی حیثیت سے سنگین الزامات لگائے گئے تھے اسے ہر طرح جانی اور مالی نقصانات کا ذمہ دار قرار دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ گو کہ یہ رپورٹ ہنوز کانفیڈنشیل تھی مگر خان بہادر کو اس کی ایک نقل مل گئی۔ نقل کے ملتے ہی وہ بدحواس ہو گیا۔ اب نیاز اسے اپنی سلامتی کے لیے بے حد خطرناک نظر آنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ معاملہ عدالت کے روبرو بھی جائے گا اور وہاں نیاز کا بیان بھی لیا جائے گا۔

بہت سوچ بچار کے بعد خان بہادر کو اپنی گلو خلاصی کے لیے ایک ہی راستہ نظر آیا۔ اور وہ تھا نیاز کا صفایا۔ نیاز کو قتل کیے بغیر کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اس کی موجودگی سے خان بہادر کو ہر وقت خطرہ درپیش تھا نیاز اس کے خلاف سارے ثبوت مہیا کر سکتا تھا۔

نیاز کے قتل کا پورا منصوبہ خان بہادر تیار کر چکا تھا۔ اسے صرف ایک شخص کا انتظار تھا جو ان دنوں راولپنڈی میں تھا۔ اور جلد ہی آنے والا تھا۔

(۴)

ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔

آسمان پر گھٹا چھائی تھی۔ کمرے میں نرم نرم بھیگے ہوئے جھونکے آ رہے تھے جن میں برسات کے پہلے چھینٹے کی مہک تھی۔ نادرہ گردن جھکائے کاغذ پر آہستہ آہستہ لکھ رہی تھی۔ اس کے برابر ہی نوشابیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ابتدائی کلاسوں کی کھلی ہوئی کتاب رکھی تھی۔ گزشتہ کئی مہینوں سے وہ پابندی کے ساتھ نادرہ کی نگرانی میں پڑھ رہا تھا۔

نادرہ نے لکھتے لکھتے فاؤنٹین پن اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور تھکی ہوئی سی انگڑائی لی۔ ٹیبل لیمپ کی ہلکی نیلگوں روشنی میں اس کے جسم پر لہروں کا مدوجزر پھیلتا چلا گیا۔ نادرہ ذرا دیر خاموش بیٹھی رہی۔ پھر اٹھ کر کھڑکی پر چلی گئی۔

نوشا مکتب کے کسی طالب علم کی طرح جھوم جھوم کر پڑھ رہا تھا۔ اس کے لب آہستہ آہستہ

کانفیڈنشیل: خفیہ۔ گلو خلاصی: چھٹکارا، نجات۔ مدوجزر: اتار چڑھاؤ۔ مکتب: اسکول۔

ل رہے تھے اور نگاہیں کتاب پر جمی تھیں۔ ذرا دیر بعد نادرہ کی آواز ابھری۔ "نوشا یہاں آؤ۔"

وہ چپ چاپ جا کر اس کے برابر کھڑا ہو گیا۔ نادرہ نے کوئی بات نہیں کی۔ خاموش کھڑی رہی۔ سامنے حد نظر تک روشنیوں کا جال پھیلا تھا۔ اونچی اونچی عمارتوں کے جھلکتے ہوئے دریچوں نے چراغاں کر دیا تھا۔ رم جھم رم جھم مینہ برس رہا تھا۔ دور افق پر بار بار بجلی کڑک رہی تھی۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے نادرہ کے بالوں کی ایک لٹ بکھر کر رخسار پر لہرا رہی تھی۔ چند منٹ بعد نادرہ نے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے آج رات بھر بارش ہو گی۔"

نوشا نے مختصر جواب دیا۔ "ہاں"

اچانک نادرہ نے بڑا بے تکا سا سوال کیا۔ "نوشا تم نے کسی لڑکی سے محبت کی ہے؟"

"نہیں۔" اس نے انکار میں گردن ہلائی۔

"تم سخت بور معلوم ہوتے ہو۔"

نوشا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ ننھی ننھی بوندوں کی جھالر روشنی کے پس منظر میں لہراتی رہی۔ ہوا میں کچھ کچھ خنکی تھی۔ نادرہ کا جسم بار بار تھرتھرا کے رہ جاتا۔ وہ بے چین نظر آ رہی تھی۔ اس نے نوشا کی جانب دیکھے بغیر پوچھا۔

"تم نے کسی لڑکی کو پیار بھی نہیں کیا؟"

اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ نوشا کو اس کی بات بڑی عجیب معلوم ہوئی۔ شرما کر بولا۔ "نہیں"

اس دفعہ نادرہ نے گھوم کر اس کی جانب دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ "سچ؟"

نادرہ کی نظریں نوشا کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں شہر کی تمام روشنیوں کا عکس جھلملا رہا تھا۔ اس نے الجھی ہوئی آواز سے کہا۔ "نوشا!"

اور نوشا نے بے اختیار اپنا منہ اس کے ہونٹوں کی جانب بڑھا دیا۔

عین اسی وقت کمرے میں کوئی آہستہ سے کھنکارا۔ نوشا نے پلٹ کر دیکھا۔ سامنے پروفیسر کھڑا تھا۔ عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے اس کی گول گول آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہاتھ کمر

کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ وہ گردن اونچی کئے باوقار انداز میں کھڑا تھا۔ نوشا اسے دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ اس نے نظریں نیچی کر لیں۔ پروفیسر نے انگلی کے اشارے سے نوشا کو اپنے قریب بلایا اور کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔

"میرے ساتھ آؤ۔"

نوشا اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دونوں نے زینے کی سیڑھیاں طے کیں اور نیچے آ گئے۔ پروفیسر کمرے کا دروازہ تھام کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ آہستہ آہستہ بڑبڑا رہا تھا۔ "قطعی ناقابل برداشت۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ یہ انسانی ہمدردی کا بے جا استعمال ہے۔" اچانک وہ غضب ناک ہو کر دھاڑا۔

"کیا سمجھے تم؟"

نوشا سر جھکائے ملزموں کی طرح کھڑا رہا۔

پروفیسر کہنے لگا۔ "مسٹر! تم اس کمرے کو فوراً خالی کر دو۔ میں پانچ منٹ سے زیادہ تم کو وقت نہیں دے سکتا۔" یہ کہہ کر وہ دہلیز کے بیچوں بیچ ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔

نوشا ہکا بکا کھڑا اس کا منہ تک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔

"مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تم ابھی تک جرائم پیشہ ہو۔ اپنی بربادی کا انتظام تم معاشرے سے لو۔ تم مجھ سے اس کا بدلہ نہیں لے سکتے، ہرگز نہیں۔ تم سزا یافتہ ہو، جیب کترے ہو، اٹھائی گیرے ہو۔ میں تم کو اس بات کا ہرگز حق نہیں دے سکتا کہ تم میری بیٹی کے ساتھ فلرٹ کرو۔ تم اور نادرہ مل کر مکمل اکائی نہیں بن سکتے۔ وہ خط مستقیم ہے اور تم خط منحنی۔ دو غیر مساوی مقداریں۔ تم مسئلہ فی التناسب سمجھتے ہو؟"

نوشا ہونق کی طرح خاموش کھڑا اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

پروفیسر زور سے چیخا۔ "میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ تین منٹ ہو چکے ہیں۔ پانچویں منٹ پر تمہارا ایک قدم گھر کے باہر ہونا چاہیے۔ اپنا سامان اٹھاؤ اور فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔"

نوشا نے گھبرا کر جلدی جلدی اپنا سامان ایک چادر میں باندھا اور گٹھری اٹھا کر بغل میں دبالی۔ پروفیسر نے معائنہ کرنے والے انسپکٹر کی طرح نوشا کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور اونچی آواز سے بولا۔

اٹھائی گیرا: اچکا، جیب کترا۔ فلرٹ: جھوٹی محبت۔ خط مستقیم: سیدھی لکیر۔ خط منحنی: ٹیڑھی لکیر۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

نوشا کمرے سے باہر نکلا۔ پروفیسر اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس نے خاموشی سے گھر کا
در دروازہ کھولا۔ نوشا سہما ہوا باہر چلا گیا۔ اس نے دروازے کا بولٹ چڑھانے کی آواز سنی۔ اندر
ام گردش میں قدموں کی آواز آہستہ آہستہ ابھری۔ چوبی زینے پر ٹھپ ٹھپ کا دبا دبا شور ہوا۔
وفیسر اوپر جا رہا تھا۔

❁ ❁ ❁

نوشا دروازے کے باہر کھڑا ایک ایک آواز ایک ایک آہٹ سنتا رہا۔ ابھی تک بوندا باندی
رہی تھی۔

آسمان پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا تھا۔ اسے رہ رہ کر پروفیسر پر غصہ آ رہا تھا۔ سالا الو کا پٹھا ہے۔
بدم چڑیا۔ نہ جانے کیسی الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے۔

لیکن اس گھر سے نکلنے کا اسے بہت افسوس تھا۔ کئی سال بعد اسے گھریلو ماحول ملا تھا۔ جہاں وہ
ش تھا، مطمئن تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اسکول میں پڑھنا شروع کر دے گا۔ بغل میں موٹی موٹی
ابیں دبا کر ٹھاٹھ سے پڑھنے جائے گا۔ پھر وہ میٹرک کا امتحان پاس کر لے گا۔ نادرہ نے یہی کہا تھا مگر
سالی نے تو انگریزی کا سبق پڑھاتے پڑھاتے پیار و محبت کا سبق پڑھانا شروع کر دیا اور اس طرح
روع کیا کہ اپنا ڈبا ہی گول ہو گیا۔ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔

نادرہ پر اسے طیش آ رہا تھا اور وہ اسے یاد بھی آئی۔ وہ چھریرے جسم کی نازک اور دلکش لڑکی جو
ت بات پر اسے ڈانٹتی پھٹکارتی تھی اور جس کے ناراض ہونے میں اسے مزا آتا تھا۔ اب وہ اسے دیکھ
کے گا یہ سوچتے سوچتے دل بوجھل ہو گیا۔ اس نے بڑی بے چارگی کے عالم میں سوچا کہ وہ کراچی
وڑ دے گا۔ سیدھا اماں کے پاس جائے گا۔ سب سالا کھٹ راگ ہے۔ بس اب گھر چلنا چاہیے۔

اسی وقت اس نے طے کیا کہ سویرے کی ٹرین سے چلا جائے گا۔ کراچی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے
وڑ دے گا۔

بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی اور رات سر پر کھڑی تھی۔ نوشا نے اسٹیشن کے مسافر
نے میں رات بسر کرنے کا پروگرام بنایا۔ معاً راجہ یاد آ گیا۔ سوچا چلتے چلتے اس سے بھی مل لینا

لوکری کا بنا ہوا۔ آشیانہ: نشیمن، گھونسلہ۔ چھریرا: دبلا پتلا۔ کھٹ راگ: بکواس، مصیبت۔

چاہیے۔ جانے اب اس سے کبھی ملاقات ہو بھی کہ نہیں۔

پروفیسر کے دروازے پر کھڑے ہونے سے اسے وحشت ہو رہی تھی۔ نوشا نے گھڑی سر پر رکھی۔ آگے بڑھا اور سڑک پر چلنے لگا۔

وہ راجہ کے پاس پہنچا تو پہر رات گزر چکی تھی۔ راجہ ایک کونے میں سکڑا سکڑایا پڑا تھا۔ قریب ہی ایک کتا لیٹا تھا۔ ترپال سے بارش کا پانی ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔ اندر کیچڑ تھی، سڑاند تھی اور گہرا اندھیرا تھا۔ نوشا ٹھٹھک کر باہر ہی رہ گیا۔ اندھیرے میں کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ کتا غرا کر زور زور سے بھونکنے لگا۔ ساتھ ہی راجہ کی آواز ابھری۔

"کون ہے؟"

نوشا نے بے تکلفی سے کہا۔ "ارے یار میں ہوں نوشا۔ پر یہاں تو بڑا اندھیرا ہے۔"

"ابے اپنی قسمت میں تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔" راجہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "باہر کیوں کھڑا ہے۔ اندر آجا۔"

نوشا گردن جھکا کر اندر داخل ہوا تو مچھروں پر تیز بو نے اچانک حملہ کر دیا۔ وہ چپ چاپ جا کر راجہ کے قریب بیٹھ گیا۔

راجہ نے پوچھا۔ "اس وقت بارش میں کیسے آگیا؟"

نوشا نے جواب دیا۔ "میں صبح کی گاڑی سے گھر جا رہا ہوں۔"

"سچ؟" راجہ کو یقین نہ آیا۔ "یار ٹھیک بتا۔"

"ابے میں کوئی جھوٹ بول رہا ہوں۔"

"مگر تو تو کہتا تھا کہ میں نے پڑھائی شروع کر دی ہے۔ اسکول میں نام لکھوانے والا ہوں۔ میٹرک کا امتحان دوں گا یہ کروں گا، وہ کروں گا۔ وہ سارا پروگرام کیا ہو گیا؟"

"بات تو کچھ ایسی ہی تھی پر یار اپنی سالی تقدیر ہی کھوٹی ہے۔"

راجہ گردن ہلا ہلا کر اپنی بھونڈی اور بے سری آواز سے گنگنانے لگا۔

تقدیر بنی بن کر بگڑی دنیا نے ہمیں برباد کیا

نوشا نے بیزاری سے کہا۔ "ابے بند کر اپنی یہ بھیرویں۔ میں بات کر رہا ہوں اور تجھے گانے

سڑاند: کسی شے کے سڑنے کی بدبو۔ سجھائی دینا: نظر آنا۔ دل گرفتہ: رنجیدہ، غمگین۔ بھیرویں: ایک راگنی جو صبح کے وقت گائی جاتی ہے۔

زی کی سوجھی ہے۔ سالے تجھے کبھی عقل نہ آئی۔"

راجہ کھسیانا ہو کر بولا۔ "یار یوں ہی دل پشوری کر لیتے ہیں۔ تو آ گیا تو ذرا بات چیت بھی ہو گئی۔ ورنہ شام سے اکیلا پڑا ہوں۔ بخار بھی ہے۔"

راجہ زور زور سے کھانسنے لگا۔ نوشا نے اس کے ماتھے کو چھو کر دیکھا۔ وہ بخار سے تپ رہا تھا۔ اس کے سارے کپڑے بارش کی بوچھاڑ سے بھیگ گئے تھے۔ وہ اس وقت دھوبی کی ناند میں پڑے ہوئے گیلے کپڑوں کی پوٹ معلوم ہو رہا تھا۔

"ابے تو نے کچھ کھایا پیا بھی؟" نوشا نے پوچھا۔

راجہ نے جواب دیا۔ "نہیں، بھوک ہی نہیں لگی۔"

"اچھا لے ایک سگرٹ تو پی۔"

"یار نوشے! کیا بات کہی تو نے۔ قسم اللہ کی دل خوش کر دیا۔"

دونوں نے سگریٹیں سلگائیں اور لمبے لمبے کش لگانے لگے۔ بارش کے قطرے ترپال پر ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ ہوا سرد تھی اور سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر نوشا نے دیوار سے پیٹھ لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ راجہ پر بھی نیند کی غنودگی طاری ہو گئی۔ دونوں لڑھک کر سو گئے۔

❁ ❁ ❁

رات کے پچھلے پہر نوشا کی آنکھ کھل گئی۔

کتا بارش سے بھیگ کر کوں کوں کرتا ہوا اس کی ٹانگوں کے اندر گھس گیا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور کتے کو گالیاں دینے لگا۔

"دھت تیرے کی۔ مار دیا سالے نے۔"

راجہ بھی اس کی آواز سن کر جاگ اٹھا۔ "ابے نوشے! کیا ہو گیا؟"

نوشا جل کر بولا۔ "ہو کیا گیا۔ یہ سالا تیرا کتا ہے۔ حرامی پن کر رہا ہے۔ تو نے بھی کیا جھمیلا پال رکھا ہے۔"

راجہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "یار انسانوں کا ساتھ تو چھوٹ گیا۔ اب جانوروں سے بھی

لہ ٹھری: ٹھنڈی نمدار سرد گلی۔ ناند: بڑا کونڈا۔ پوٹ: گٹھری۔ جھمیلا: مصیبت۔

دوستی نہ کروں۔"

اس کے لہجے میں بلا کا کرب تھا۔ نوشا کانپ اٹھا۔ مینہ برسنا بند ہو گیا تھا۔ آسمان شفاف نظر آرہا تھا۔ ہلکی ہلکی کافوری روشنی پھیلنے لگی تھی۔ نوشا نے جھک کر باہر دیکھا۔

"سویرا ہونے والا ہے۔ اب میں اسٹیشن چلوں گا۔"

"ابے چلا جانا۔ تھوڑی دیر تو اور بیٹھ۔"

نوشا کے پاس اس وقت ۴۰ روپے تھے اور کچھ ریزگاری۔ اس نے جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور راجہ کو دیتے ہوئے بولا۔

"لے یہ روپے رکھ لے۔"

"نہیں یار، میں تیرے روپے نہیں لوں گا۔ میرا تو کسی نہ کسی طرح کام چل ہی جاتا ہے۔ تو اتنے دنوں بعد گھر جا رہا ہے۔ خالی ہاتھ جائے گا تو سب کیا کہیں گے؟"

نوشا اصرار کرنے لگا۔ مگر راجہ نے نوٹ نہیں لیا۔ "تو مجھے ایک سگرٹ اور پلا دے۔ گلا سوکھ رہا ہے۔"

دونوں نے ایک ایک سگرٹ سلگائی۔ تمباکو کا دھواں ہر طرف بکھر گیا۔ راجہ نے تکیے کے نیچے سے ٹٹول کر بڑا سا چاقو نکالا۔ نوشا کی طرف بڑھا کر بولا۔

"لے اسے رکھ لے۔ کچھ کام ہی دے جائے گا۔ میرے لیے تو اب یہ بیکار ہو گیا ہے۔"

"میں نے چاقو واقو رکھنا چھوڑ دیا ہے۔" نوشا نے چاقو لینے سے صاف انکار کر دیا۔ "اسے تو اپنے ہی پاس رکھ۔"

"تو اسے میری نشانی ہی سمجھ کر رکھ لے۔" اس کی آواز دردناک ہو گئی۔ "میرے پاس رہے گا تو کسی دن اپنے ہی ہاتھوں اپنا سینہ نہ چیر ڈالوں۔ یار سالی اس زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔ تف ہے ایسے جینے پر۔"

نوشا نے چاقو لے کر چپ چاپ اپنے پاس رکھ لیا۔ راجہ کے چہرے کو دیکھا جو صبح کاذب کی دھندلی دھندلی روشنی میں بڑا خوفناک نظر آرہا تھا۔ راجہ ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ وہ بار بار بے چینی سے کروٹ بدلنے لگتا۔ آخر جب نوشا اٹھ کر جانے لگا تو راجہ نے عاجزی

بلا کا کرب: بہت زیادہ دکھ۔ دردناک: دکھ بھری۔ صبح کاذب: صبح کی روشنی جس کے بعد پھر اندھیرا چھا جاتا ہے۔

کہا۔

"تھوڑی دیر اور ٹھہر جا۔ ایک تیرا ہی تو سہارا رہ گیا تھا۔ اس دنیا میں اب اپنا کوئی نہیں رہا۔"

اس کی آواز بھرائی گئی۔ وہ سسکیاں بھرنے لگا۔ اس نے تڑپ کر نوشا کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس پر اپنا منہ رکھ کر بولا۔ "نوشے! خدا کے لیے مجھے چھوڑ کر نہ جا۔ میرا کوئی نہیں۔ ہائے میرا کوئی نہیں رہا۔" وہ چیخیں مار مار کر رونے لگا نوشا کا دل بھر آیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر راجہ کے چہرے پر ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

دونوں کچھ دیر اسی طرح روتے رہے۔ ان کی سسکیاں گہری خاموشی میں ابھرتی رہیں۔ پھر راجہ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے نوشا سے کہا۔

"جایار! تجھے دیر ہو رہی ہے۔ ماں تیرا انتظار کر رہی ہو گی۔"

نوشا نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ جیب سے سگرٹ کا پیکٹ نکالا اور راجہ کو دے دیا۔ راجہ نے اپنی گٹھری اٹھائی اور آگے بڑھا۔

باہر آ کر اس نے مڑ کر راجہ کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ نوشا کو دیکھ کر وہ تلخی سے بولا۔ "یار اب تو جا۔ کیوں خواہ مخواہ دیر کر رہا ہے۔" یہ کہتے کہتے کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔ نوشا بڑھ کر سڑک پر آ گیا۔ دور تک راجہ کی کھانسی اسے سنائی دیتی رہی۔

وہ اسٹیشن پہنچا تو گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ اس نے ٹکٹ خریدا اور تیسرے درجے کے ڈبے میں جا کر بیٹھ گیا ابھی گاڑی چھوٹنے میں دیر تھی مگر مسافروں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔

گھنٹہ بھر بعد ٹرین روانہ ہو گئی۔ ڈبا مسافروں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ لوگ ہنس رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔

نوشا ایک کونے میں خاموش بیٹھا تھا۔ اسے اپنا شہر یاد آ رہا تھا۔ اپنا محلہ اور محلے کی وہ گلی جس کے نکڑ پر میونسپلٹی کی لالٹین تھی۔ جہاں راتوں کو سب لڑکے مل کر کھیلتے تھے۔ اودھم مچاتے تھے۔ گلی کی نیچی نیچی دیواروں والے وہ مکان جن میں اس کا بھی گھر تھا اماں، سلطانہ اور انو۔ نہ جانے سب کیسے ہوں گے؟ اسے دیکھ کر کیا کہیں گے؟ ایک کے بعد دوسرا خیال۔ ایک یاد کے بعد دوسری یاد۔

خیالات کا سلسلہ تھا کہ پھیلتا ہی جا رہا تھا۔ ٹرین آہنی پٹریوں پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ اور وہ یادوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہا تھا۔

❁ ❁ ❁

نوشا ٹرین سے اپنے شہر کے اسٹیشن پر اترا تو رات ہو چکی تھی۔ اس نے خاموشی سے پلیٹ فارم طے کیا اور اسٹیشن کی عمارت سے باہر آ گیا۔ ایک رکشا والے کی جانب بڑھتے ہوئے شبہ ہوا کہ کہیں اسے دیکھا ہے۔ وہ دبلا پتلا نوجوان تھا۔ سر پر بڑے بڑے بال۔ لمبے لمبے ہاتھ پاؤں اور اندر دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔

رکشا والے نے بھی غور سے دیکھا اور چیخ کر بے اختیار اس کے گلے سے چمٹ گیا۔

"ابے نوشے تو آ گیا؟"

وہ شامی تھا۔ اس سے مل کر نوشا کو بڑی خوشی ہوئی۔ "ابے یہ دھندا تو نے کب سے شروع کر دیا؟"

شامی مری ہوئی آواز سے بولا۔ "یار ابا کے مرنے کے بعد تو سالی مصیبتوں نے اپنا گھر دیکھ لیا۔"

"ابے تیرے ابا کا انتقال ہو گیا۔ کب؟"

"یار ان کو مرے ہوئے یہ تیسرا سال ہے۔"

نوشا نے پوچھا۔ "دکان بھی تو تھی تیری؟"

"وہ تو ابا کی بیماری کے زمانے ہی میں بیچ دی تھی۔" شامی اپنی پریشانیاں سنانے لگا۔ وہ صبح کے وقت ابھی تک اخبار بیچتا تھا اور رات کو سائیکل رکشا چلاتا تھا۔ گھر میں سات کھانے والے تھے اور ان سب کا بوجھ تنہا اس کے کندھوں پر تھا۔ اس کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ وہ رک رک کر کھانس رہا تھا۔ باتیں کرتے کرتے اچانک اس نے نوشا سے پوچھا۔

"مگر اس وقت تم جاؤ گے کہاں؟"

نوشا کو اس کے سوال پر کسی قدر حیرت ہوئی۔ "گھر جاؤں گا اور کہاں؟"

"کونسا گھر؟" شامی نے دریافت کیا۔

نوشا گھبرا گیا۔ "ابے کیا اڑا رہا ہے؟ اپنے گھر جاؤں گا۔ وہی گلی والا گھر اور میرا کونسا گھر ہے؟"

شامی نے گردن نیچی کر لی اور رسان سے بولا۔ "تو یار تجھے کچھ بھی پتہ نہیں؟"

نوشا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے صرف ایک لفظ کہا۔ "کیا؟"

"اس گھر میں تو حاجی رحیم بخش رہتے ہیں۔"

نوشا نے گھبرا کر کہا۔ "اور میری اماں؟"

شامی نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "ان کا تو دو سال ہوئے انتقال ہو گیا۔"

نوشا کے سینے پر زبردست گھونسا لگا۔ وہ شامی کے گلے سے لپٹ کر بے اختیار رونے لگا۔ دیر اس کی سسکیاں ابھرتی رہیں۔ پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز سے پوچھا۔ "میری بڑی بہن اور انو ں ہیں؟"

شامی نے ٹالنا چاہا۔ "تمہارے جانے کے بعد گھر میں بڑی عجیب عجیب باتیں ہوئیں۔ تم رے ساتھ گھر چل کر بیٹھو تو اطمینان سے سب کچھ بتاؤں گا۔ بڑی لمبی داستان ہے۔

نوشا نے اصرار کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "یار کچھ تو بتا دے۔ تو نے مجھے یہ خبر بتا کر بے ت مار دیا۔ ہائے اماں تم کو دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔" نوشا پھر منہ بسور کر رونے لگا۔

"اچھا اب تم رکشے پر بیٹھ جاؤ۔ میں تم کو راستے میں بتا دوں گا۔ بادل گھرے ہوئے ہیں۔ مینہ نے لگا تو گھر پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔"

نوشا رکشا پر سوار ہو گیا۔ شامی نے پیڈل پر پیر مارا۔ رکشا آگے روانہ ہوا۔ تھوڑی دور جانے بعد نوشا نے اپنا سوال دہرایا۔ "یار یہ تو بتا دے کہ سلطانہ اور انو کہاں ہیں؟"

"انو کی نہ پوچھ۔ اس سالے نے تو ناک کٹوا دی۔"

"کیوں؟" نوشا نے چونک کر پوچھا۔

"سالا ہیجڑوں کے ساتھ رہتا ہے۔ روزانہ شام کو خوب پوڈر ووڈر لگا کر ان کے ساتھ بازار گھومتا ہے۔ پھٹا پھٹ تالیاں پیٹتا ہے۔ عورتوں کی طرح اٹھلا اٹھلا کر کمر لچکاتا ہے۔ اسے ذرا شرم نہیں آتی۔ یار برا نہ ماننا۔ میرا بھائی ہوتا تو سالے کے چار ٹکڑے کر کے ڈال دیتا۔ اس نے بے غیرتی کی حد کر دی۔"

نوشا کا خون کھول اٹھا۔ تڑپ کر پوچھا۔ "وہ سالا رہتا کہاں ہے؟"

"نہ جانے کہاں رہتا ہے۔ پر شام کو بازار میں ضرور نظر آتا ہے۔"

نوشا نے ایک لمبی "ہوں" کی۔ پوچھا۔ "سلطانہ کا بھی کچھ اتا پتا ہے۔ وہ آج کل کہاں ہے؟"

شامی اس وقت سڑک کی چڑھائی پر رکشا لے جا رہا تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ نوشا نے ذرا دیر بعد اپنی بات دہرائی تو اس نے بتایا۔

"وہ تو نیاز کے ساتھ رہتی ہے۔"

نوشا بھونچکا ہو کر بولا۔ "نیاز کے ساتھ؟"

"ہاں بے وہی نیاز کباڑیا جس کی بازار میں دکان تھی۔ اب تو وہ بڑا آدمی بن گیا ہے۔ کوٹھی میں رہتا ہے۔ ایک دم صاحب بہادر لگتا ہے۔ کوٹ پتلون پہنتا ہے اور موٹر کار سے نیچے بات نہیں کرتا۔ یار اس کے تو بڑے ٹھسّے ہیں۔ دیکھے گا تو پہچان بھی نہ سکے گا۔"

"مگر سلطانہ اس کے یہاں کیوں چلی گئی؟"

"یار! بات یہ ہے نا کہ تیری اماں نے نیاز سے نکاح پڑھوالیا تھا۔ تو ناراض نہ ہو تو ایک بات بتاؤں۔" شامی نے بات کہتے کہتے قدرے تامل کیا، پھر دبی زبان سے بتایا۔ "میں نے سنا ہے کہ سلطانہ کی اور نیاز کی کچھ لگ سٹ ہو گئی تھی۔ اس لیے نیاز نے تیری اماں کو مروا دیا۔ سارے محلے والے یہی کہتے ہیں۔" وہ رکشا چلاتا جا رہا تھا اور رک رک کر بول رہا تھا۔ "سالے نے بہت حرامی پن کیا۔ ایک نمبر بدمعاش ہے۔"

نوشا خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ چند لمحے بعد اس نے شامی سے دریافت کیا۔ "تجھے نیاز کا گھر معلوم ہے؟"

"ہاں معلوم ہے۔"

"تو مجھے وہیں لے چل۔"

"یار اس وقت وہاں جا کر کیا کرے گا وہ تو یہاں سے بہت دور ہے۔"

وہ نیاز کی کوٹھی پر جانے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ شامی نے مجبوراً رکشا اس طرف موڑ دی۔ اب نوشا بہت کم بول رہا تھا۔ کبھی کبھار ہوں ہاں کر دیتا۔ شامی رک رک کر محلے کے بارے میں اِدھر اُدھر کی باتیں سناتا رہا۔

نیاز کی کوٹھی کے پھاٹک پر پہنچ کر شامی نے رکشا ٹھہرا لیا۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ نوشا نے رکشا سے اتر کر شامی کو کرائے کا ایک روپیہ دینا چاہا تو اس نے خفا ہو کر گالی دی۔ منہ بگاڑ کر بولا۔ "یار!

بھونچکا: حیران۔ ٹھسا: شان و شوکت، ٹھاٹھ باٹ۔ تامل: وقفہ۔ لگ سٹ: مراد دوستی، محبت۔

کراچی سے چند ٹکے کمالایا تو مجھ پر رعب جھاڑ رہا ہے۔ یہ روپیہ اپنے پاس رکھ۔ صبح گھر آنا۔ دونوں
ا ہاتھ کھانا کھائیں گے۔ اور دیکھ نیاز کے ہاں تیرا زیادہ ٹھیرنا ٹھیک نہیں۔" وہ اچک کر رکشا پر سوار
ر پیڈل پر پیر مارا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

نوشا کوٹھی کے پھاٹک پر خاموش کھڑا رہا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ البتہ ایک کھڑکی سے ہلکی
ی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ مگر یہ روشنی اس قدر دھیمی تھی کہ تاریکی ہی تاریکی نظر آتی تھی۔ نوشا
نے آہستہ سے پھاٹک کھولا اور احاطے کے اندر چلا گیا۔ مگر برساتی کی طرف جانے کے بجائے وہ
رختوں کی جانب مڑ گیا۔ وہاں گہرا اندھیرا تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر چلنے لگا۔ خشک پتے اس کے
توں کے نیچے آہٹ پیدا کرتے۔ کسی نامعلوم خوف سے وہ بار بار چونک پڑتا۔

اس نے آہستہ سے جوتے اتارے اور درختوں کے نیچے ایک طرف رکھ دیئے۔ قریب ہی
ی گٹھری بھی رکھ دی۔ اس نے دبے دبے قدموں چل کر کوٹھی کا ایک چکر لگایا۔ ہر طرف سے
ائنہ کیا۔ پھر اپنی گٹھری کے پاس آیا۔ چاقو نکال کر کھولا اور اسے دانتوں میں دبا کر دیوار پر چڑھ گیا۔
ٹھی کے اندر گہری خاموشی تھی۔ وہ ایک کھلی ہوئی کھڑکی سے اندر چلا گیا۔ اور ہولے ہولے قدم
لتا ہوا اس کے کمرے کے قریب پہنچا جہاں روشنی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔

اس نے برآمدے کے ایک ستون کی آڑ لے کر کمرے کے اندر نظر ڈالی۔ نیاز سامنے صوفے
ایک طرف جھکا ہوا نیم دراز تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ رک رک کر گہری سانس بھر رہا تھا۔
نا آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ نیاز کو ذرا بھی خبر نہ ہوئی۔ نوشا خاموشی سے
رے کے اندر چلا گیا۔

اچانک اس کا پیر کسی چیز سے ٹکرایا۔ آہٹ ہوئی۔ نیاز نے چونک کر حیرت زدہ نظروں سے
نا کو دیکھا۔ مگر قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتا نوشا آن کی آن میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔ کھلا ہوا چاقو
ھ میں تھا۔ اس نے پہلا ہی وار بھرپور کیا۔ تین پسلیاں چیر ڈالیں۔ نیاز زور سے چیخا۔

"ہائے مار ڈالا۔"

وہ کرسی سے لڑھک کر فرش پر گر پڑا۔ نوشا ایک ٹانگ کے بل جھک کر بیٹھ گیا اور پے بہ پے
کرنا شروع کر دیئے۔ اس نے نیاز کے سینے کو، پیٹ کو، گردن کو، بازوؤں کو، ہر ہر حصے کو چیر ڈالا۔

اہالم: دریائی، مکمل خاموشی۔ پے بہ پے: مسلسل۔

نیاز کا جیتا جیتا خون کمرے میں ہر طرف پھیل گیا۔ وہ ذرا دیر تک تڑپتا رہا، کراہتا رہا۔ پھر اس نے دم توڑ دیا۔

❁ ❁ ❁

نوشا لاش کے سرہانے بیٹھا بری طرح ہانپ رہا تھا۔ خون سے بھرا ہوا چاقو ابھی تک ہاتھ میں تھا۔ اسی اثنا میں کمرے کے باہر آہٹ ابھری۔ نوشا نے پلٹ کر دیکھا۔ سلطانہ کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر نوشا کو دیکھا۔ پھر نیاز کی خون میں ڈوبی ہوئی لاش دیکھی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔

"ہائے نوشا تو نے یہ کیا کر دیا۔"

نوشا خاموشی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ سلطانہ اس کی سرخ سرخ آنکھیں دیکھ کر سراسیمہ ہو گئی۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "اب تو کہاں جا رہا ہے؟"

نوشا نے خونخوار نظروں سے اسے مڑ کر دیکھا۔ گردن ہلا کر بولا۔ "تھانے!" اس کی آواز ڈھول کی طرح گرجدار تھی۔

سلطانہ جھپاک سے آگے بڑھی۔ دروازے پر پہنچی اور اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ "میں تجھے نہیں جانے دوں گی۔"

نوشا غرا کر چیخا۔ "ہٹ جا حرامزادی چھنال میرے سامنے سے۔ ٹکڑے کر کے یہیں تیرے یار کے پاس ڈال دوں گا۔"

وہ پاگلوں کی طرح بولتی چلی گئی۔ "تو مجھے بھی مار دے۔ تو مجھے بھی مار دے۔"

نوشا نے قریب پہنچ کر اس زور سے دھکا دیا کہ وہ دروازے سے ٹکرا کر گر پڑی۔ نوشا کمرے سے باہر نکل گیا۔

سلطانہ دوڑ کر اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔ "نوشا میرے بھائی۔ اللہ کے لیے رک جا۔ میری بات تو سن لے۔" وہ گڑگڑا کر رونے لگی۔

سراسیمہ: حیران پریشان۔ چھنال: بدکار عورت۔

نوشا کے سر پر خون سوار تھا۔ اس نے پیر کو زور سے جھٹکا دیا۔ سلطانہ لڑھک کر دور جا گری۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ سلطانہ فرش پر پڑی ہوئی رک رک کر کہہ رہی تھی۔

"نوشا، خدا کے لیے رک جا!"

"نوشا! نوشا!"

اس کی آواز دیر تک ابھرتی رہی۔

نوشا کوٹھی سے نکل کر باغیچے میں آگیا۔ درختوں کے خشک پتوں پر اس کے قدموں کی آہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ کوٹھی میں خادمہ بدحواس ہو کر زور زور سے چیخ رہی تھی۔ نوشا نے احاطہ طے کیا۔ پھاٹک کھولا اور باہر سڑک پر آکر بوجھل قدموں سے چلنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں خون سے لتھڑا ہوا چاقو تھا۔ وہ پولیس اسٹیشن جا رہا تھا۔

ٹھپ، ٹھپ، ٹھپ۔

سنسان سڑک پر نوشا کے قدموں کی آواز رک رک کر ابھرتی رہی۔